فہرست

اس شمارے میں
اس شمارے میں — نعیم احمد — ۴

قرآنیات
سورۂ یونس (۲) — جاوید احمد غامدی — ۶

معارف نبوی
صدقہ میں کیا چیز مکروہ ہے — امین احسن اصلاحی — ۱۵

مقالات
شان نزول — امام حمید الدین فراہی — ۲۲
جدید فلسفہ وسائنس سے مرعوبیت کے اثرات — امین احسن اصلاحی — ۲۵

افادات
نبی صلی اللہ علیہ وسلم بحیثیت ایک مدبر اور ماہر سیاست — امین احسن اصلاحی — ۳۱

سیر و سوانح
حضرت ضمام بن ثعلبہ رضی اللہ عنہ — محمد وسیم اختر مفتی — ۳۹

یسئلون
نقد حدیث — امین احسن اصلاحی — ۴۳

ادبیات
برکت اتفاق — مولانا الطاف حسین حالی — ۵۰

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

نعیم احمد

شمارے کا آغاز حسب روایت جناب جاوید احمد غامدی کے ترجمۂ قرآن ''البیان'' سے ہوا ہے۔ اس اشاعت میں سورۂ یونس (۱۰) کی آیات ۷۱-۹۳ کا ترجمہ اور مختصر حواشی شامل ہیں۔ اس حصے میں پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم سے فرمایا گیا ہے کہ جو لوگ ابھی تک ایمان نہیں لائے، انھیں نوح، موسیٰ اور ہارون علیہم السلام کی سرگذشت سناؤ۔ کھلی نشانیوں کے باوجود حق کا انکار کرنے والوں اور فرعون کو، جو خود کو خدا سمجھتا تھا، کس طرح غرق کیا گیا۔ اس کے جسم کو دنیا والوں کے لیے نشان عبرت بنا دیا گیا۔

''معارف نبوی'' میں ''موطا امام مالک'' کی تین روایات کا انتخاب شامل ہے۔ پہلی روایت صدقہ کے بارے میں ہے، جس میں عام پائے جانے والے اس تاثر کی وضاحت کی گئی ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی آل کے لیے صدقہ جائز نہیں ہے۔ دوسری روایت میں طلب علم کے حوالے سے حکیم لقمان کی اپنے بیٹے کو یہ وصیت ہے کہ علم حاصل کرنے کے لیے علما کی مجالس میں شرکت کرو۔ تیسری روایت مظلوم کی بددعا سے بچنے کے بارے میں ہے۔ اس میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے آزاد کردہ غلام کو سرکاری چراگاہ پر نگران بنانے کے بعد تلقین کی ہے کہ لوگوں پر ظلم سے باز رہیں۔

''مقالات'' میں مولانا حمید الدین فراہی کا مضمون ''شان نزول'' شامل اشاعت ہے۔ اس میں انھوں نے بیان کیا ہے کہ قرآن کی ہر سورہ کے نزول کا مقصد پیش آنے والے معاملات کی وضاحت ہے۔ بیان ایسا ہے کہ کسی قسم کا شک و شبہ نہ ہو۔ ''مقالات'' ہی کے تحت مولانا امین احسن اصلاحی کا مضمون شامل ہے۔ اس میں مغربی اقوام کی فلسفہ و سائنس میں ایجادات سے متاثر افراد کا ذکر ہے۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ جو قومیں ترقی کی دوڑ میں پیچھے رہ جاتی ہیں، وہ ترقی یافتہ قوموں سے مرعوب رہتی ہیں۔ ان کی تقلید میں ہمارا نوجوان اور تعلیم یافتہ طبقہ اپنی روایات کی مخالفت اور اپنے مذہب سے بے زاری فیشن کے طور پر اپنا رہا ہے۔ ان کی خوبیوں کے بجائے ان کی خامیوں کو اپنانے سے اپنی شناخت کھو رہا

ہے۔اگر وہ سائنسی ترقی میں ہم سے آگے ہیں تو اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ وہ مذہب و معاشرت اور معیشت و سیاست کے اصولوں میں بھی ہم سے آگے ہیں۔

''افادات'' میں ''نبی صلی اللہ علیہ وسلم بحیثیت ایک مدبر اور ماہر سیاست'' کے عنوان سے مولانا امین احسن اصلاحی کا مضمون شائع کیا گیا ہے۔اس میں یہ بات بیان ہوئی ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی حیات مبارکہ سے دنیا کو جو درس دیا، اس کے مطابق ایمان داری اور سچائی جس طرح انفرادی زندگی کی بنیاد ہے، اسی طرح اجتماعی اور سیاسی معاملات سے بھی گہرا تعلق رکھتی ہے۔

''سیر و سوانح'' کے تحت محمد وسیم اختر مفتی کے مضمون میں جلیل القدر صحابی حضرت ضمام بن ثعلبہ رضی اللہ عنہ اور ان کے قبیلے بنو سعد کے ایمان لانے کا واقعہ بیان ہوا ہے۔اس میں حضرت ضمام اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان ہونے والے خوب صورت مکالمے کا ذکر ہے۔

''یسئلون'' میں مولانا اصلاحی سے پوچھا گیا یہ سوال نقل کیا ہے کہ کیا حدیث میں مزید تحقیق کی ضرورت ہے، کیونکہ کئی احادیث ایسی ہیں جو قرآن کے فرمودات اور رسول کے عمل سے مطابقت نہیں رکھتیں۔مولانا اصلاحی نے اس کا جواب یہ دیا ہے کہ حدیث کی مکمل تحقیق کی اہمیت سے کوئی عقل مند انکار نہیں کر سکتا۔عدم مطابقت سائل کو غلط فہمی کے نتیجے میں نظر آئی ہے، ورنہ ان احادیث کو جمع و توفیق اور ترجیح کے اصول پر دیکھا جائے تو تضاد اور عدم مطابقت ختم ہو جائے گی۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

''ادبیات'' میں مولانا الطاف حسین حالی کی ایک نظم شائع کی ہے۔اس میں انھوں نے اتفاق میں برکت کی خوبیوں کو نظم کیا ہے۔

البیان
جاوید احمد غامدی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سورۃ یونس

(۶)

(گذشتہ سے پیوستہ)

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

وَاتۡلُ عَلَيۡهِمۡ نَبَاَ نُوۡحٍ‌ۘ اِذۡ قَالَ لِقَوۡمِهٖ يٰقَوۡمِ اِنۡ كَانَ كَبُرَ عَلَيۡكُمۡ مَّقَامِىۡ
وَتَذۡكِيۡرِىۡ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ فَعَلَى اللّٰهِ تَوَكَّلۡتُ فَاَجۡمِعُوۡۤا اَمۡرَكُمۡ وَشُرَكَآءَكُمۡ ثُمَّ
لَا يَكُنۡ اَمۡرُكُمۡ عَلَيۡكُمۡ غُمَّةً ثُمَّ اقۡضُوۡۤا اِلَىَّ وَلَا تُنۡظِرُوۡنِ ﴿۷۱﴾ فَاِنۡ تَوَلَّيۡتُمۡ فَمَا
سَاَلۡتُكُمۡ مِّنۡ اَجۡرٍ‌ؕ اِنۡ اَجۡرِىَ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ‌ۙ وَاُمِرۡتُ اَنۡ اَكُوۡنَ مِنَ الۡمُسۡلِمِيۡنَ ﴿۷۲﴾

اِنھیں نوح کی سرگذشت سناؤ، (اے پیغمبر)، جب اُس نے اپنی قوم سے کہا: میری قوم کے لوگو، اگر میرا (تمھارے اندر) رہنا[۸۵] اور اللہ کی آیتیں سنا کر یاد دہانی کرنا تم پر گراں ہو گیا ہے تو میں نے اللہ ہی پر بھروسا کیا۔ تم سب مل کر، البتہ اپنی بات ٹھیرا لو اور اپنے شریکوں کو بھی ساتھ ملا لو، پھر تمھارے اِس فیصلے میں تمھیں کوئی تردد نہ رہے، پھر میرے ساتھ جو کرنا چاہتے ہو، کر گزرو[۸۶] اور مجھے مہلت نہ دو۔ اِس

۸۵؎ قرآن نے بتایا ہے کہ وہ ایک لمبی مدت تک اپنی قوم میں رہے۔ یہ اُسی رہنے کا ذکر ہے۔

۸۶؎ اصل الفاظ ہیں: 'ثُمَّ اقۡضُوۡۤا اِلَىَّ'۔ اِن میں 'اِلَیَّ' کا صلہ اقدام پر دلیل ہے۔ یعنی جو فیصلہ کرنا ہے، کر لو اور میرے خلاف جو اقدام کرنا چاہتے ہو، کرو۔

فَكَذَّبُوْهُ فَنَجَّيْنٰهُ وَمَنْ مَّعَهٗ فِي الْفُلْكِ وَجَعَلْنٰهُمْ خَلٰٓئِفَ وَاَغْرَقْنَا الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُنْذَرِيْنَ ﴿۷۳﴾

ثُمَّ بَعَثْنَا مِنْۢ بَعْدِهٖ رُسُلًا اِلٰى قَوْمِهِمْ فَجَآءُوْهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ فَمَا كَانُوْا لِيُؤْمِنُوْا بِمَا كَذَّبُوْا بِهٖ مِنْ قَبْلُ كَذٰلِكَ نَطْبَعُ عَلٰى قُلُوْبِ الْمُعْتَدِيْنَ ﴿۷۴﴾

ثُمَّ بَعَثْنَا مِنْۢ بَعْدِهِمْ مُّوْسٰى وَهٰرُوْنَ اِلٰى فِرْعَوْنَ وَمَلَا۠ئِهٖ بِاٰيٰتِنَا فَاسْتَكْبَرُوْا وَكَانُوْا قَوْمًا مُّجْرِمِيْنَ ﴿۷۵﴾ فَلَمَّا جَآءَهُمُ الْحَقُّ مِنْ عِنْدِنَا قَالُوْٓا اِنَّ هٰذَا لَسِحْرٌ

کے بعد بھی اعراض کرو گے تو میں نے تم سے کوئی صلہ نہیں مانگا ہے۔ میرا صلہ تو اللہ کے ذمے ہے اور مجھے حکم دیا گیا ہے کہ (خدا کا) فرماں بردار بن کر رہوں۔ اِس پر بھی اُنھوں نے اُسے جھٹلا دیا تو ہم نے اُس کو نجات دی اور اُن کو بھی جو اُس کے ساتھ کشتی میں تھے اور اُنھیں جانشین بنایا اور اُن سب لوگوں کو غرق کر دیا جنھوں نے ہماری آیتوں کو جھٹلایا تھا۔ سو دیکھ لو کہ اُن کا انجام کیا ہوا جنھیں (اِس عذاب سے پہلے) متنبہ کر دیا گیا تھا۔ ۷۱-۷۳

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

پھر نوح کے بعد ہم نے کتنے رسولوں کو اُن کی قوموں کی طرف بھیجا۔ سو وہ کھلی کھلی نشانیاں لے کر اُن کے پاس آئے، مگر جس چیز کو پہلے جھٹلا چکے تھے، اُسے پھر اُنھوں نے مان کر نہیں دیا۔ ہم حد سے گزر جانے والوں کے دلوں پر اِسی طرح مہر لگا دیا کرتے ہیں[۸۷]۔ ۷۴

اُن کے بعد پھر ہم نے موسیٰ اور ہارون کو اپنی نشانیوں کے ساتھ فرعون اور اُس کے سرداروں کی طرف بھیجا تو وہ بھی اکڑ بیٹھے اور (حقیقت یہ ہے کہ) وہ مجرم لوگ تھے[۸۸]۔ چنانچہ جب ہماری طرف سے

۸۷؎ یہ اُسی سنت الٰہی کی طرف اشارہ ہے جس کی رو سے کوئی شخص حق کے مقابلے میں سرکشی اختیار کرتا اور جانتے بوجھتے اُسے ماننے سے انکار کر دیتا ہے تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اُسے مہلت دی جاتی ہے۔ پھر اِس مہلت سے وہ اگر فائدہ اٹھانے کے لیے تیار نہیں ہوتا تو اِس جرم کی پاداش میں اُس کے دل و دماغ پر مہر کر دی جاتی ہے تاکہ وہ قبول حق کی سعادت سے ہمیشہ کے لیے محروم ہو جائے۔

مُّبِیۡنٌ ﴿۷۶﴾ قَالَ مُوۡسٰی اَتَقُوۡلُوۡنَ لِلۡحَقِّ لَمَّا جَآءَ کُمۡ اَسِحۡرٌ ھٰذَا وَلَا یُفۡلِحُ
السّٰحِرُوۡنَ ﴿۷۷﴾ قَالُوۡۤا اَجِئۡتَنَا لِتَلۡفِتَنَا عَمَّا وَجَدۡنَا عَلَیۡہِ اٰبَآءَ نَا وَتَکُوۡنَ لَکُمَا
الۡکِبۡرِیَآءُ فِی الۡاَرۡضِ وَمَا نَحۡنُ لَکُمَا بِمُؤۡمِنِیۡنَ ﴿۷۸﴾ وَقَالَ فِرۡعَوۡنُ ائۡتُوۡنِیۡ

حق اُن کے سامنے آیا[89] تو اُنھوں نے کہہ دیا کہ یہ تو کھلا جادو ہے۔ موسیٰ نے کہا: کیا تم حق کے بارے میں یہ کہتے ہو،[90] جبکہ وہ تمھارے پاس آ گیا ہے؟[91] کیا یہ جادو ہے؟ (نہیں، ہرگز نہیں۔ یہ قطعی حق ہے) اور (حق کے مقابلے میں) جادوگر کبھی کامیاب نہیں ہوتے۔[92] اُنھوں نے جواب دیا: کیا تم ہمارے پاس اِس لیے آئے ہو کہ ہمیں اُس طریقے سے پھیر دو جس پر ہم نے اپنے باپ دادا کو پایا ہے اور اِس ملک میں تم دونوں کی بڑائی قائم ہو جائے؟[93] ہم تمھاری بات ماننے والے نہیں ہیں۔ فرعون نے حکم دیا کہ تمام

۸۸؎ یعنی عقل و فطرت کے تقاضوں سے انحراف کے باعث پہلے ہی مجرم ہو چکے تھے۔

۸۹؎ اشارہ ہے اُن معجزات کی طرف جن کے ساتھ موسیٰ و ہارون علیہما السلام نے اپنا یہ دعویٰ اُن کے سامنے پیش کیا کہ وہ دونوں خدا کے پیغمبر کی حیثیت سے اُن کے پاس آئے ہیں۔

۹۰؎ اصل الفاظ ہیں: 'اَتَقُوۡلُوۡنَ لِلۡحَقِّ؟' اِن میں 'لِلۡحَقِّ' کا 'ل'، 'فی' کے معنی میں ہے اور 'تَقُوۡلُوۡنَ' کا مفعول بلاغت کے تقاضے سے حذف ہو گیا ہے۔

۹۱؎ اِس جملے کی بلاغت بھی قابل توجہ ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

''...حق جب تک نگاہوں سے اوجھل ہو، اُس وقت تک تو اُس کی نسبت کوئی شخص اگر کوئی نظریاتی بحث اٹھائے تو اُس کو کسی حد تک معذور قرار دیا جا سکتا ہے۔ لیکن جب حق سامنے موجود ہو تو اُس کے باب میں کٹ حجتی کرنا ویسا ہی ہے، جس طرح کوئی نصف النہار کے سورج کے بارے میں تردد کا اظہار کرے۔'' (تدبر قرآن ۴/ ۷۷)

۹۲؎ مطلب یہ ہے کہ معجزے کو جادو کہنے کی جسارت کر رہے ہو تو اِسے جادوگروں کے سامنے پیش کر کے دیکھ لو، تمھیں معلوم ہو جائے گا کہ یہ کیا ہے اور جادو کیا ہوتا ہے؟ تم دیکھو گے کہ جادوگر اِس کے مقابلے میں بالکل خائب و خاسر ہو کر رہ جائیں گے۔

۹۳؎ مصر کے ارباب اقتدار اسرائیلیوں کی بڑھتی ہوئی تعداد سے پہلے ہی خوف زدہ تھے۔ حضرت موسیٰ اور

www.javedahmadghamidi.org www.al-mawrid.org

بِکُلِّ سٰحِرٍ عَلِیۡمٍ ﴿۷۹﴾ فَلَمَّا جَآءَ السَّحَرَۃُ قَالَ لَہُمۡ مُّوۡسٰۤی اَلۡقُوۡا مَاۤ اَنۡتُمۡ
مُّلۡقُوۡنَ ﴿۸۰﴾ فَلَمَّاۤ اَلۡقَوۡا قَالَ مُوۡسٰی مَا جِئۡتُمۡ بِہِ السِّحۡرُ اِنَّ اللّٰہَ سَیُبۡطِلُہٗ اِنَّ
اللّٰہَ لَا یُصۡلِحُ عَمَلَ الۡمُفۡسِدِیۡنَ ﴿۸۱﴾ وَیُحِقُّ اللّٰہُ الۡحَقَّ بِکَلِمٰتِہٖ وَلَوۡ کَرِہَ
الۡمُجۡرِمُوۡنَ ﴿۸۲﴾ فَمَاۤ اٰمَنَ لِمُوۡسٰۤی اِلَّا ذُرِّیَّۃٌ مِّنۡ قَوۡمِہٖ عَلٰی خَوۡفٍ مِّنۡ فِرۡعَوۡنَ

ماہر جادوگروں کو میرے پاس حاضر کرو۔ چنانچہ جب جادوگر آ گئے تو موسیٰ نے اُن سے کہا: تمھیں جو ڈالنا ہے، ڈالو۔[94] پھر جب اُنھوں نے ڈالا تو موسیٰ نے کہا: یہ جو کچھ تم لائے ہو، یہ جادو ہے۔[95] یقین رکھو، اللہ ابھی اِسے باطل کیے دیتا ہے۔ اللہ (اِس طرح کے موقعوں پر) فساد کرنے والوں کے عمل کو نتیجہ خیز نہیں ہونے دیتا اور اللہ اپنے کلمات سے حق کو حق کر دکھاتا ہے، اگرچہ مجرموں کو کتنا ہی ناگوار ہو۔[96] پر

حضرت ہارون پر اپنی حکومت قائم کرنے اور لوگوں کو اُن کے آبائی دین سے برگشتہ کرنے کا یہ الزام اِسی پس منظر میں لگایا گیا ہے تاکہ قبطی عصبیت پوری قوت کے ساتھ اِس خطرے کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار ہو جائے۔ دعوت حق کے جواب میں اِس طرح کے اشغلے ہر دور کے ارباب اقتدار چھوڑتے رہے ہیں۔

۹۴؎ موسیٰ علیہ السلام کا یہ ارشاد بتا رہا ہے کہ اُنھیں اپنے رب کے وعدوں پر کس درجہ اعتماد تھا۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

> ''...اُن کو اللہ تعالیٰ کے وعدۂ نصرت پر پورا بھروسا تھا کہ خواہ جادوگر جتنا بڑا جادو بھی دکھائیں، اُن کے پاس اِس کا توڑ موجود ہے۔ اِس وجہ سے اُنھوں نے کسی پیش بندی سے بے نیاز ہو کر اُنھی کو پہل کرنے کا موقع دیا اور یہ گویا میدان مقابلہ میں اُن کی پہلی جیت تھی۔ اِس لیے کہ اِس کے بعد حریف کو جو شکست ہوئی، وہ خود اُس کے اپنے منتخب کیے ہوئے میدان میں ہوئی۔'' (تدبر قرآن ۴/ ۷۸)

۹۵؎ یہ فرعونیوں کی بات کا جواب ہے کہ جو کچھ میں نے پیش کیا تھا، وہ جادو نہیں ہے، بلکہ جادو درحقیقت یہ ہے جو تمھارے جادوگر پیش کر رہے ہیں۔

۹۶؎ یعنی اُن موقعوں پر فساد کرنے والوں کے عمل کو باطل کر دیتا اور حق کو حق کر دکھاتا ہے، جب اُس کے پیغمبر اتمام حجت کے لیے کسی قوم کی طرف مبعوث کیے جاتے ہیں۔ یہ اُسی سنت الٰہی کا حوالہ ہے جس کی وضاحت ہم آیت

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

وَمَلَاۡئِہِمۡ اَنۡ یَّفۡتِنَہُمۡ وَاِنَّ فِرۡعَوۡنَ لَعَالٍ فِی الۡاَرۡضِ وَاِنَّہٗ لَمِنَ الۡمُسۡرِفِیۡنَ ﴿۸۳﴾

موسیٰ کو فرعون کے ڈر سے اور خود اپنی قوم کے بڑوں کے ڈر سے اُس کی قوم کے چند نوجوانوں کے سوا کسی نے نہیں مانا[۱۷۹] کہ کہیں فرعون اُنھیں کسی فتنے میں نہ ڈال دے۔ حقیقت یہ ہے کہ فرعون اُس ملک

۱۷۸ کے تحت کر چکے ہیں۔

۱۷۹ اصل میں 'فَمَآ اٰمَنَ لِمُوۡسٰی' کے الفاظ آئے ہیں۔ اللہ و رسول پر ایمان کو بالعموم 'اٰمَنَ بِہٖ' سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اِس کے بجائے 'اٰمَنَ لَہٗ' کے الفاظ یہاں اِس لیے اختیار کیے گئے ہیں کہ اِن نوجوانوں نے حضرت موسیٰ کے دعوے کی صداقت تو بے شک تسلیم کر لی تھی، مگر تسلیم و تفویض اور اطاعت و انقیاد کے اُس مقام تک ابھی نہیں پہنچے تھے جس پر 'اٰمَنَ بِہٖ' کے الفاظ دلالت کرتے ہیں۔ آگے کی آیات میں اِسی بنا پر اُنھیں ایمان کے اِن تقاضوں کو پورا کرنے کی دعوت دی گئی ہے۔

قرآن کا ارشاد ہے کہ 'اٰمَنَ لَہٗ' کی یہ سعادت بھی بنی اسرائیل کے نوجوانوں ہی کو حاصل ہوئی۔ دعوت حق کی تاریخ بتاتی ہے کہ یہ معاملہ صرف موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ نہیں ہوا۔ اِس دعوت پر لبیک کہنے کی سعادت پہلے مرحلے میں بالعموم نوجوانوں ہی کو حاصل ہوتی ہے۔ اِس کی وجہ کیا ہے؟ استاذ امام لکھتے ہیں:

"...اِس کی واضح نفسیاتی وجہ یہ ہے کہ حضرات انبیا جس ہمہ گیر دعوت اسلام کو لے کر اٹھتے ہیں، اُس کو ابتدائی مراحل میں آگے بڑھ کر قبول کرنا بڑی بلند حوصلگی، بلکہ بڑے جان جوکھم کا کام ہوتا ہے۔ اِس کی ہمت وہ لوگ آسانی سے نہیں کر سکتے جو روایات و رسوم سے مرعوب اور حالات و مصالح کی رعایت کے خوگر ہوں۔ ایسے لوگوں کا حجاب آہستہ آہستہ ہی ٹوٹتا ہے۔ نوجوانوں میں اِس طرح کی مرعوبیت و مغلوبیت کم ہوتی ہے، اِس وجہ سے اُن کو جب دعوت حق اپیل کر لیتی ہے تو وہ اُس کے لیے دنیوی عواقب سے بے پروا ہو کر اٹھ کھڑے ہوتے ہیں، نہ وہ اپنے بڑوں اور بزرگوں کی سرزنش کی کچھ زیادہ پروا کرتے نہ وقت کے ارباب اقتدار کی برہمی کو خاطر میں لاتے ہیں۔ حضرت موسیٰ کے معاملے میں حالات کا یہ خاص پہلو بھی قابل لحاظ ہے کہ ملک میں جو ارسٹو کریسی برسر اقتدار تھی، وہ نسلاً بھی حضرت موسیٰ کی قوم سے بالکل الگ تھی اور اُس دور میں جو شخص تخت حکومت پر تھا، وہ بھی، جیسا کہ آیت کے الفاظ سے واضح ہے، طبعاً نہایت جبار اور سرکش تھا۔ ایسے حالات میں، ظاہر ہے کہ وہی لوگ اُن کا ساتھ دینے کے لیے آگے بڑھ سکتے تھے جو اپنی حمیت حق کے جوش و جذبہ کو دبا سکنے پر قادر نہ ہوں۔" (تدبر قرآن ۴/ ۷۹)

www.javedahmadghamidi.com www.almawrid.org

وَقَالَ مُوْسٰی يٰقَوْمِ اِنْ كُنْتُمْ اٰمَنْتُمْ بِاللّٰهِ فَعَلَيْهِ تَوَكَّلُوْٓا اِنْ كُنْتُمْ مُّسْلِمِيْنَ ﴿۸۴﴾
فَقَالُوْا عَلَی اللّٰهِ تَوَكَّلْنَا رَبَّنَا لَا تَجْعَلْنَا فِتْنَةً لِّلْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۸۵﴾ وَنَجِّنَا بِرَحْمَتِكَ
مِنَ الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۸۶﴾

وَاَوْحَيْنَآ اِلٰی مُوْسٰی وَاَخِيْهِ اَنْ تَبَوَّاٰ لِقَوْمِكُمَا بِمِصْرَ بُيُوْتًا وَّاجْعَلُوْا بُيُوْتَكُمْ
قِبْلَةً وَّاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۸۷﴾ وَقَالَ مُوْسٰی رَبَّنَآ اِنَّكَ اٰتَيْتَ

میں بڑا جبار تھا اور اُن لوگوں میں سے تھا جو حد سے گزر جاتے ہیں۔ موسیٰ نے کہا: میری قوم کے لوگو، تم خدا پر ایمان لائے ہو تو اُسی پر بھروسا کرو، اگر تم اپنے آپ کو اُس کے حوالے کر چکے ہو۔[۹۸] اِس پر اُنھوں نے جواب دیا: ہم نے خدا ہی پر بھروسا کیا ہے۔ اے ہمارے رب، ہمیں اِن ظالم لوگوں کے لیے فتنہ نہ بنا[۹۹] اور اپنی رحمت سے ہمیں اِس منکر قوم سے نجات عطا فرما دے۔ ۸۵-۸۶

(خدا سے یہی تعلق جوڑنے کے لیے) ہم نے موسیٰ اور اُس کے بھائی (ہارون) کی طرف وحی کی کہ اپنی قوم کے لیے مصر میں کچھ گھر ٹھیرا لو[۱۰۰] اور جو گھر تم سب اپنے لیے ٹھیراؤ، اُنھیں قبلہ بنا لو[۱۰۱] اور (اُن

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

---

۹۸ اسلام کی حقیقت یہی حوالگی ہے۔ سچا ایمان اِسی کے نتیجے میں پیدا ہوتا ہے جس کا لازمی تقاضا خدا پر توکل ہے۔ موسیٰ علیہ السلام نے ایمان کا یہی تقاضا لوگوں کو سمجھایا ہے۔

۹۹ فتنہ کے معنی یہاں ہدف اور نشانہ کے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ اُن کو اتنی ڈھیل نہ دے کہ وہ ہم کو بالکل ہی ظلم و ستم کی آماج گاہ بنا لیں۔

۱۰۰ یعنی مصر کے مختلف حصوں میں کچھ گھر مسجد کی حیثیت سے مخصوص کر لیے جائیں جن میں بنی اسرائیل نماز کے اوقات میں جمع ہوں اور مل کر خدا کی عبادت کریں۔ انبیا علیہم السلام کے دین میں اصلاح و تربیت کا یہی نظام ہمیشہ سے قائم رہا ہے۔ حضرت موسیٰ نے بھی اپنی قوم کی مذہبی تنظیم کا آغاز کیا تو اللہ تعالیٰ نے سب سے پہلے اِسی کی ہدایت فرمائی۔

۱۰۱ اِس سے مراد وہ گھر ہیں جو حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون نے اپنے اور اپنے متعلقین اور اپنے گرد و پیش کے لوگوں کی نماز کے لیے مخصوص کیے ہوں گے۔ فرمایا کہ عارضی طور پر اِنھی گھروں کو قبلہ کی حیثیت دے دی جائے تا کہ

فِرۡعَوۡنَ وَمَلَاَهٗ زِيۡنَةً وَّاَمۡوَالًا فِى الۡحَيٰوةِ الدُّنۡيَا رَبَّنَا لِيُضِلُّوۡا عَنۡ سَبِيۡلِكَ رَبَّنَا اطۡمِسۡ عَلٰٓى اَمۡوَالِهِمۡ وَاشۡدُدۡ عَلٰى قُلُوۡبِهِمۡ فَلَا يُؤۡمِنُوۡا حَتّٰى يَرَوُا الۡعَذَابَ الۡاَلِيۡمَ ﴿۸۸﴾ قَالَ قَدۡ اُجِيۡبَتۡ دَّعۡوَتُكُمَا فَاسۡتَقِيۡمَا وَلَا تَتَّبِعٰٓنِّ سَبِيۡلَ الَّذِيۡنَ لَا يَعۡلَمُوۡنَ ﴿۸۹﴾

میں) نماز کا اہتمام کرو اور (اے موسیٰ)، ایمان والوں کو خوش خبری دو (کہ کامیابی بالآخر اُنھی کو حاصل ہوگی)۔[۱۰۲] موسیٰ نے دعا کی، اے ہمارے رب، تو نے فرعون کو اور اُس کے سرداروں کو دنیا کی زندگی میں شان وشوکت اور مال واسباب سے نوازا ہے۔ اے ہمارے رب، تاکہ اِس کا نتیجہ یہ ہو کہ وہ لوگوں کو تیری راہ سے بھٹکا دیں۔[۱۰۳] اے ہمارے رب، اُن کے مال (اب) تو غارت کر دے اور اُن کے دلوں کو اِس طرح بند کر دے کہ ایمان نہ لائیں، یہاں تک کہ دردناک عذاب دیکھ لیں۔[۱۰۴] فرمایا: تمھاری اور تمھارے بھائی کی دعا قبول ہوئی۔ اب تم دونوں ثابت قدم رہو اور اُن لوگوں کے راستے پر نہ چلو جو علم نہیں رکھتے۔[۱۰۵] ۸۷-۸۹

نماز کی اقامت میں وہ وحدت پیدا ہو جائے جو اُس کے لیے ہمیشہ مطلوب رہی ہے۔ مصر سے ہجرت کے بعد بنی اسرائیل کے لیے یہی حیثیت تابوت کو حاصل ہوئی، یہاں تک کہ بیت المقدس تعمیر ہوا اور اُنھوں نے اُس کو اپنا قبلہ بنالیا۔

۱۰۲؎ یہ بشارت جس طرح ظاہر ہوئی، اُس کا ذکر آگے آیت ۹۳ میں ہوا ہے۔

۱۰۳؎ اصل الفاظ ہیں: 'رَبَّنَا، لِيُضِلُّوۡا عَنۡ سَبِيۡلِكَ'۔ اِن میں 'ل' انجام اور نتیجے کو ظاہر کرتا ہے۔ یعنی مال و اسباب عطا ہوئے تو اُس کا نتیجہ یہ نکلا کہ خدا کی اِس عنایت پر شکرگزار ہونے کے بجاے سرکشی پر اتر آئے۔

۱۰۴؎ یہ ہجرت سے پہلے کی دعا ہے جو فرعون اور اُس کے اکابر پر اتمام حجت کے بعد کی گئی۔ اِس طرح کی دعا اللہ کے رسول اُسی وقت کرتے ہیں، جب وہ اپنے مخاطبین کے ایمان سے آخری درجے میں مایوس ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ یہ محض دعا نہیں ہوتی، بلکہ خود خدا کے فیصلے کا اعلان ہوتا ہے۔

۱۰۵؎ مطلب یہ ہے کہ تم اور تمھارے ساتھی اب اِن سرکشوں کی چھوت سے اپنے آپ کو محفوظ رکھیں اور اِن کے ساتھ جو معاملہ ہونے والا ہے، اُس پر اپنے دل میں نرمی کے جذبات نہ پیدا ہونے دیں کہ مبادا کوئی سفارش کا کلمہ

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

وَجٰوَزْنَا بِبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ الْبَحْرَ فَاَتْبَعَهُمْ فِرْعَوْنُ وَجُنُوْدُهٗ بَغْيًا وَّعَدْوًا حَتّٰٓى
اِذَآ اَدْرَكَهُ الْغَرَقُ قَالَ اٰمَنْتُ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّا الَّذِيْٓ اٰمَنَتْ بِهٖ بَنُوْٓا اِسْرَآءِيْلَ وَاَنَا
مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ ﴿٩٠﴾ آٰلْئٰنَ وَقَدْ عَصَيْتَ قَبْلُ وَكُنْتَ مِنَ الْمُفْسِدِيْنَ ﴿٩١﴾ فَالْيَوْمَ
نُنَجِّيْكَ بِبَدَنِكَ لِتَكُوْنَ لِمَنْ خَلْفَكَ اٰيَةً وَاِنَّ كَثِيْرًا مِّنَ النَّاسِ عَنْ اٰيٰتِنَا لَغٰفِلُوْنَ ﴿٩٢﴾

بنی اسرائیل کو، (اِس کے بعد) ہم نے سمندر پار کرایا تو فرعون اور اُس کے لشکروں نے سرکشی اور شرارت کی راہ سے[١٠٦] اُن کا پیچھا کیا۔ یہاں تک کہ جب فرعون ڈوبنے لگا تو بول اٹھا: میں نے مان لیا کہ اُس کے سوا کوئی الٰہ نہیں جس پر بنی اسرائیل ایمان لائے ہیں اور میں بھی سر اطاعت جھکا دینے والوں میں سے ہوں۔ کیا اب! اِس سے پہلے تو تم نافرمانی کرتے رہے اور فساد برپا کرنے والوں میں سے تھے[١٠٧]۔ سو آج ہم تیرے بدن کو بچالیں گے تاکہ اپنے بعد آنے والوں کے لیے تو (خدا کے عذاب کی) نشانی بن کر رہے[١٠٨]۔ حقیقت یہ ہے کہ بہت سے لوگ ہماری نشانیوں سے غافل ہی رہتے ہیں۔

تمھاری زبان سے نکل جائے۔

بظاہر یہ تنبیہ حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون علیہما السلام کو کی گئی ہے، لیکن روے سخن، اگر غور کیجیے تو اُنھی سرکشوں کی طرف ہے جو اب عذاب کے مستحق ہو گئے ہیں۔

١٠٦؎ فرعون کا یہ فعل یوں تو ہر پہلو سے سرکشی اور شرارت تھا، لیکن یہاں یہ الفاظ خاص طور پر اُس سرکشی اور شرارت کی طرف اشارہ کرتے ہیں جو اُس نے بنی اسرائیل کو جانے کی اجازت دینے کے بعد پھر اُن کا پیچھا کر کے کی۔

١٠٧؎ یہ الفاظ ضروری نہیں ہے کہ کہے گئے ہوں۔ زیادہ امکان یہ ہے کہ یہ صورت حال کی تصویر ہو۔

١٠٨؎ خدا کی یہ بات حرف بہ حرف پوری ہوئی۔ فرعون کی لاش کو غرقابی کے بعد سمندر نے قبول نہیں کیا، بلکہ عذاب الٰہی کی ایک عبرت ناک نشانی کے طور پر باہر پھینک دیا۔ یہ لاش بعد میں لوگوں کو ملی بھی اور اُنھوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا کہ خدا کے مقابلے میں سرکشی کا انجام کیا ہوتا ہے۔ جزیرہ نماے سینا کے مغربی ساحل پر جبل فرعون اور حمام فرعون اِسی واقعے کی یادگاریں ہیں۔ ابوزنیمہ سے چند کلومیٹر اوپر شمال کی جانب علاقے کے باشندے آج بھی اُس جگہ کی نشان دہی کرتے ہیں، جہاں یہ لاش پڑی ہوئی ملی تھی۔ دور حاضر میں اہل مصر کی جو ممی کی ہوئی لاشیں

www.javedahmadghamidi.org www.al-mawrid.org

وَلَقَدْ بَوَّاْنَا بَنِیْٓ اِسْرَآءِ یْلَ مُبَوَّاَ صِدْقٍ وَّرَزَقْنٰھُمْ مِّنَ الطَّیِّبٰتِ فَمَا اخْتَلَفُوْا حَتّٰی
جَآءَ ھُمُ الْعِلْمُ اِنَّ رَبَّکَ یَقْضِیْ بَیْنَھُمْ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ فِیْمَا کَانُوْا فِیْهِ یَخْتَلِفُوْنَ ﴿۹۳﴾

ہم نے بنی اسرائیل کو عزت کا ٹھکانا دیا اور اُنھیں نہایت عمدہ رزق عطا فرمایا۔ پھر اُنھوں نے جو کچھ بھی اختلافات کیے، اُس وقت کیے جب اُن کے پاس (خدا کا بھیجا ہوا) علم آچکا تھا[۱۰۹]۔ یقین رکھو کہ تمھارا پروردگار قیامت کے دن اُن کے درمیان اُن چیزوں کا فیصلہ کر دے گا جن میں وہ اختلاف کرتے رہے ہیں[۱۱۰]۔ ۹۰-۹۳

دریافت ہوئی ہیں، اُن میں سے بھی ایک لاش کے بارے میں، جسے فرعون منفتہ کی لاش قرار دیا جاتا ہے، عام خیال یہ ہے کہ یہ اُسی فرعون کی لاش ہے۔ یہ لاش قاہرہ کے عجائب خانے میں محفوظ ہے اور زبان حال سے کہہ رہی ہے کہ دیکھو مجھے جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

> ''...اِس لاش کے بارے میں اثریات کے ماہرین چاہے اختلاف کریں کہ یہ اُسی فرعون کی لاش ہے یا کسی اور کی، لیکن اُن کے اٹکل پچو اندازوں کے مقابل میں قرآن کا یہ چودہ سوسال پہلے کا بیان زیادہ قابل اعتماد ہے۔ اِس طرح قدرت نے اُس کی لاش کو عبرت کی ایک ایسی نشانی بنا دیا جو آج کے فرعونوں کے لیے بھی محفوظ ہے، لیکن دیکھنے کے لیے آنکھوں کی ضرورت ہے اور اِس دنیا میں عبرت پذیر آنکھوں سے زیادہ کم یاب کوئی شے بھی نہیں۔''
>
> (تدبر قرآن ۴/ ۸۴)

۱۰۹؎ یعنی حق کے پوری طرح واضح ہو جانے کے بعد اختلاف کیا جس کی وجہ، ظاہر ہے کہ فرقہ بندی کے داعیات اور تعصّبات ہی ہو سکتے ہیں۔ چنانچہ اِس کی تمام ذمہ داری اب اُنھی پر ہے۔

۱۱۰؎ یہ بڑی سخت وعید ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اِس وقت تو ہر دھاندلی اور کتمان حق کی ہر کوشش کے لیے توجیہات تلاش کر سکتے ہو، مگر جب فیصلے کا دن آئے گا تو تمام حقائق بے نقاب ہو جائیں گے اور تمھارا سب کچا چٹھا تمھارے سامنے ہوگا۔ اُس وقت کہنے کے لیے کچھ بھی باقی نہ رہے گا۔

[باقی]

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

امین احسن اصلاحی
ترتیب و تدوین: خالد مسعود۔سعید احمد

صدقہ میں کیا چیز مکروہ ہے

(مَا یُکْرَہُ مِنَ الصَّدَقَۃِ)

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

حَدَّثَنِی عَنْ مَالِکٍ أَنَّہُ بَلَغَہُ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ: لَا تَحِلُّ الصَّدَقَۃُ لِآلِ مُحَمَّدٍ اِنَّمَا ھِیَ أَوْسَاخُ النَّاسِ.

امام مالک سے روایت ہے کہ ان کو یہ بات پہنچی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ آل محمد کے لیے صدقہ جائز نہیں۔ یہ لوگوں کے جسموں کا میل کچیل ہے۔

وضاحت

یہ روایت امام مالک کی بلاغات میں سے ہے۔ امام مالک نے اس میں راوی کا نام نہیں لکھا، مگر یہ یاد رکھیے کہ یہ روایت پانچ چھ طریقوں سے مرفوع ہے، اور ان سب میں ابن شہاب موجود ہے۔ یہ روایت قرآن کے بالکل خلاف ہے اور عقل کے بھی خلاف ہے۔ میرے نزدیک اس کو شیعوں کے امام ابن شہاب نے گھڑا ہے تاکہ آل محمد کی برہمنیت کو قائم کیا جائے۔ پہلے میرا خیال یہ تھا کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بات یوں فرمائی ہوگی کہ 'لا تحل الصدقة لآل محمد'، اور یہ فرمانے کی وجہ یہ رہی ہوگی کہ یہودیوں میں یہ ہوا تھا کہ صدقہ اور زکوٰۃ کی جتنی رقوم ہوتی تھیں، وہ یہود کے قبیلہ بنی لاوی کا حق مان لی گئی تھیں۔ قربانی کے جتنے جانور ہوتے تھے، ان کے گوشت کا

بہترین حصہ ان کا حصہ ہوتا تھا اور خیرات کی تمام رقمیں ان کی ہوتی تھیں۔ دوسرے لوگ ان سے محروم کر دیے گئے۔ میرا خیال یہ تھا کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس فتنہ کے سد باب کے لیے فرمادیا: 'لا تحل الصدقة لآل محمد' کہ آل محمد کے لیے صدقہ جائز نہیں۔ اس کے بعد روایت کا جتنا حصہ ہے، وہ ابن شہاب کا اسی طرح کا اضافہ ہے، جس طرح کا اضافہ انھوں نے پیچھے بیان ہونے والی 'العین حق' (نظر بد ایک حقیقت ہے) کی روایت میں کیا ہے۔ وہاں 'العین حق' کی تاویل تو ہو سکتی ہے، لیکن اس کے بعد نظر بد اتارنے کا جوٹوٹکا ابن شہاب نے بتایا ہے کہ نظر لگانے والے شخص کو پکڑا جائے، وہ اپنے تہمد کے نیچے کا حصہ دھوئے اور دھوون اس شخص پر انڈیل دی جائے جس کو نظر لگی ہو۔ تو یہ ابن شہاب کا اپنا اضافہ ہے۔ لیکن اب میری رائے یہ ہے کہ یہ پوری روایت جھوٹی ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ اگر صدقہ 'او ساخ الناس' (لوگوں کا میل کچیل) ہے تو یہ میل کچیل ان لوگوں کے لیے ہے جو مال دار ہیں اور لوگوں کا حق ادا نہیں کرتے۔ محتاج اور نادار اگر پاتے ہیں تو اپنا حق پاتے ہیں۔ یہ بات قرآن مجید سے ثابت ہے کہ یہ 'حق معلوم' یعنی ان کا معین حق ہے*۔ قرآن مجید میں یہ بتایا گیا ہے کہ لوگوں کے پاس جو زائد مال ہوتا ہے، وہ اصل میں دوسروں کے حقوق ہیں جو امرا کی امانت میں دیے جاتے ہیں اور اس سے ان کا امتحان مقصود ہوتا ہے کہ وہ حقوق ادا کرتے ہیں یا نہیں۔ اگر وہ اس مال کو ہڑپ کر لیں تو وہ غلاظت کا ڈھیر ہے جو وہ کھا رہے ہیں۔ مستحقین کے لیے یہ غلاظت کا ڈھیر نہیں، بلکہ اللہ کا دیا ہوا مال ہے۔

www.javedahmadghamidi.com www.almawrid.org

پھر اس روایت میں آل محمد کو برہمنوں کی طرز کا ایک پورا خاندان بنا دیا گیا اور اس میں تمام بنی ہاشم کو شامل کر دیا گیا۔ تمام بنی ہاشم کے لیے صدقات حرام کر دیے، اس کی وجہ یہ ہے کہ اوپر بیان کردہ روایت کی رو سے چونکہ 'الید العلیا' (اوپر کا ہاتھ) افضل ہے اور 'الید السفلی' (نیچے کا ہاتھ) مفضول ہے تو آل محمد کے لیے یہ کس طرح جائز ہوتا کہ ان کا ہاتھ نیچے رہے، چاہے وہ غریب ہوں یا امیر۔ ان کو تو بہرحال سر پر بیٹھنا ہے۔ وہ نیچے کس طریقہ سے اتر سکتے ہیں۔

پھر یہ سوال بھی اہم ہے کہ تمام بنی ہاشم کس طریقہ سے آل محمد میں شامل ہو گئے؟ یہ واقعہ ہے کہ عرب میں اور ہمارے ہاں بھی یہ رواج رہا ہے کہ آدمی کی نسل لڑکی سے نہیں چلتی، بلکہ لڑکے سے چلتی ہے۔ بالفرض سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کی اولاد کے متعلق مان لیجیے کہ وہ آل محمد ہیں، لیکن بنی ہاشم کے پورے خاندان کو کس طریقہ سے آل محمد ہونے کا شرف حاصل ہو جاتا ہے؟ صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ روایت صرف بنی ہاشم کا سر اونچا کرنے کے لیے گھڑی گئی ہے، ورنہ اس کی کوئی بنیاد نہیں۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آل محمد میں اگر کچھ لوگ فی الواقع محتاج ہوں اور ان کے پاس زندگی گزارنے کے وسائل

---

* المعارج ۷۰: ۲۴۔

موجود نہ ہوں تو کیا ان کو بھوک سے مرنے دیا جائے گا اور صدقہ سے ان کی مدد نہیں کی جائے گی؟ اگر اس مدد کے لیے کوئی حیلے تراشے جاتے ہیں تو اس سے حقیقت تو نہیں بدل جائے گی۔ اس صورت میں بھی ان کا ہاتھ تو نیچے ہی رہے گا۔

حَدَّثَنِیُ عَنُ مَالِكٍ عَنُ عَبُدِ اللّٰهِ بُنِ اَبِیُ بَكُرٍ عَنُ اَبِیُهِ اَنَّ رَسُوُلَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیُهِ وَسَلَّمَ اسُتَعُمَلَ رَجُلًا مِنُ بَنِیُ عَبُدِ الْاَشُهَلِ عَلَی الصَّدَقَةِ، فَلَمَّا قَدِمَ سَأَلَهُ اِبِلًا مِّنَ الصَّدَقَةِ فَغَضِبَ رَسُوُلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیُهِ وَسَلَّمَ حَتّٰی عُرِفَ الْغَضَبُ فِیُ وَجُهِهِ وَكَانَ مِمَّا یُعُرَفُ بِهِ الْغَضَبُ فِیُ وَجُهِهِ اَنُ تَحُمَرَّ عَیُنَاهُ ثُمَّ قَالَ اِنَّ الرَّجُلَ لَیَسُأَلُنِیُ مَالَا یَصُلُحُ لِیُ وَلَا لَهُ، فَاِنُ مَنَعُتُهُ كَرِهُتُ الْمَنُعَ، وَ اِنُ أَعُطَیُتُهُ أَعُطَیُتُهُ مَالَا یَصُلُحُ لِیُ وَلَا لَهُ، فَقَالَ الرَّجُلُ: یَارَسُوُلَ اللّٰهِ، لَا اَسُئَلُكَ مِنُهَا شَیْئًا اَبَدًا.

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

عبداللہ بن ابو بکر اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بنی عبدالاشہل کے خاندان میں ایک شخص کو صدقے کی وصولی پر مامور کیا۔ وہ جب واپس آئے تو انھوں نے صدقے کے اونٹوں میں سے ایک اونٹ مانگا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ناپسندیدگی کا اظہار کیا، یہاں تک کہ آپ کے چہرے سے آپ کا غصہ ظاہر ہونے لگا۔ آپ کا غصہ چہرے سے اس وقت ظاہر ہوتا تھا جب آپ کی آنکھیں سرخ ہو جاتی تھیں۔ پھر آپ نے فرمایا کہ یہ شخص مجھ سے وہ چیز مانگتا ہے جو میرے لیے ٹھیک ہے، نہ اس کے لیے۔ اگر نہ دوں تو میں نہ دینے کو برا سمجھتا ہوں، اگر دوں تو میں اس کو وہ چیز دوں گا جو میرے لیے ٹھیک ہے، نہ اس کے لیے۔ تو اس آدمی نے کہا کہ یا رسول اللہ، میں اب اس میں سے کبھی کوئی چیز نہیں مانگوں گا۔

وضاحت

یہ حدیث بالکل واضح ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مانگنے کی یہ شکل بھی مکروہ ہے۔

حَدَّثَنِی عَنْ مَالِكٍ عَنْ زَیْدِ بْنِ اَسْلَمَ عَنْ اَبِیهِ اَنَّهُ قَالَ قَالَ: عَبْدُ اللّٰهِ بْنُ الْأَرْقَمِ أُدْلُلْنِی عَلٰی بَعِیرٍ مِّنَ الْمَطَایَا اَسْتَحْمِلُ عَلَیْهِ اَمِیرَ الْمُؤْمِنِینَ؟ فَقُلْتُ: نَعَمْ جَمَلًا مِّنَ الصَّدَقَةِ، فَقَالَ عَبْدُ اللّٰهِ ابْنُ الْأَرْقَمِ: أَتُحِبُّ اَنَّ رَجُلًا بَادِنًا فِی یَوْمٍ حَارٍّ غَسَلَ لَكَ مَا تَحْتَ اِزَارِهِ وَ رُفْغَیْهِ ثُمَّ أَعْطَاكَهُ فَشَرِبْتَهُ؟ قَالَ: فَغَضِبْتُ وَقُلْتُ: یَغْفِرُ اللّٰهُ لَكَ اَتَقُولُ لِی مِثْلَ هٰذَا؟ فَقَالَ عَبْدُ اللّٰهِ بْنُ الْاَرْقَمِ: اِنَّمَا الصَّدَقَةُ أَوْسَاخُ النَّاسِ یَغْسِلُونَهَا عَنْهُمْ.

زید بن اسلم کے والد راوی ہیں کہ عبداللہ بن الارقم نے ان سے کہا کہ مجھے سواری کے اونٹوں کی نشان دہی کرو کہ میں ان میں سے امیر المومنین سے سواری کے لیے مانگوں، تو میں نے کہا: اچھا، صدقہ کے اونٹوں میں سے ایک مانگیے، تو عبداللہ بن الارقم نے کہا کہ کیا آپ چاہتے ہیں کہ ایک موٹا فربہ آدمی گرمی کے دن اپنے تہمد کے نیچے کے اور اپنی رانوں کے بیچ کے حصے کو دھوئے، پھر وہ دھوون آپ کو دے اور آپ اس کو پئیں؟ کہتے ہیں: میں نے بڑے غصے میں کہا: اللہ آپ کو معاف کرے۔ کیا آپ مجھ سے اس طرح کی بات کہہ رہے ہیں؟ تو عبداللہ بن الارقم نے کہا کہ صدقہ لوگوں کی میل کچیل ہے جس کو وہ اپنے سے دھوتے ہیں۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

وضاحت

یہ بات ٹھیک ہے کہ ایک غیر مستحق صدقے کے مال میں سے مانگے تو وہ اس کے لیے ناجائز ہوگا، لیکن یاد رکھیے کہ مستحق کے لیے وہ مال ناپاک نہیں، بلکہ یہ اس کا حق ہے جو خود اللہ تعالیٰ نے مقرر کیا ہے۔

طلب علم کے بارے میں

(مَا جَاءَ فِی طَلَبِ الْعِلْمِ)

حَدَّثَنِی عَنْ مَالِكٍ اَنَّهُ بَلَغَهُ اَنَّ لُقْمَانَ الْحَکِیمَ أَوْصٰی ابْنَهُ، فَقَالَ:

يَا بُنَيَّ جَالِسِ الْعُلَمَاءَ وَ زَاحِمْهُمْ بِرُكْبَتَيْكَ فَإِنَّ اللّٰهَ يُحْيِي الْقُلُوبَ بِنُورِ الْحِكْمَةِ كَمَا يُحْيِي اللّٰهُ الْأَرْضَ الْمَيْتَةَ بِوَابِلِ السَّمَاءِ.

امام مالک کو یہ بات پہنچی ہے کہ لقمان حکیم نے اپنے بیٹے کو وصیت کی اور کہا: بیٹے، علما کی صحبت اختیار کرلو اور ان کے گھٹنے کے ساتھ گھٹنا ملا کر ان کے آگے بیٹھا کرو۔ اللہ تعالیٰ حکمت کے نور سے اسی طرح دلوں کو زندہ کرتا ہے، جس طرح وہ مردہ زمین کو آسمانی بارش سے زندہ کرتا ہے۔

وضاحت

یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا قول نہیں، بلکہ لقمان حکیم کا قول ہے۔ لقمان عرب کے حکما میں سے تھے، پیغمبر نہیں تھے۔ ان کی تاریخ بھی مجہول ہے۔ اگر قرآن مجید نے ان کا ذکر نہ کیا ہوتا تو ان کے متعلق ہم اچھی یا بری رائے قائم کرنے کی کسی پوزیشن میں نہیں تھے۔ لقمان حکیم کی بیٹے کو یہ نصیحت قرآن مجید میں بیان نہیں ہوئی ہے۔ امام مالک نے کہیں سے سنی ہے اور حدیث کی کتاب میں اس کو درج کر دیا ہے اور ایسے نہ جانے کتنے اقوال ہیں جو انھوں نے جمع کیے ہیں۔ انھوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ایسے اقوال بھی نقل کیے ہیں جو ہمیں انجیلوں میں نہیں ملے۔ معلوم ہوتا ہے کہ ان کو حکمت کی اچھی باتوں سے خاص دل چسپی تھی۔ نصیحت اپنی جگہ بہت قیمتی ہے۔ علما کی صحبت میں بیٹھنے سے حکمت کی باتیں سننے کو ملتی ہیں اور آدمی میں اخذ کی صلاحیت ہو تو وہ ان سے فائدہ اٹھاتا ہے۔ یہ چیز دل کی زندگی کا باعث ہوتی ہے۔

www.al-mawrid.org www.javedahmadghamidi.org

مظلوم کی بد دعا سے بچنے کے بارے میں

(مَا يُتَّقٰى مِنْ دَعْوَةِ الْمَظْلُومِ)

حَدَّثَنِي عَنْ مَالِكٍ عَنْ زَيْدِ بْنِ أَسْلَمَ عَنْ أَبِيهِ أَنَّ عُمَرَ بْنَ الْخَطَّابِ اسْتَعْمَلَ مَوْلًى لَهُ يُدْعٰى هُنَيًّا عَلَى الْحِمٰى، فَقَالَ: يَا هُنَيُّ اضْمُمْ جَنَاحَكَ

عَنِ النَّاسِ وَاتَّقِ دَعْوَةَ الْمَظْلُوْمِ فَاِنَّ دَعْوَةَ الْمَظْلُوْمِ مُسْتَجَابَةٌ وَأَدْخِلْ رَبَّ الصُّرَيْمَةِ وَالْغُنَيْمَةِ، وَاِيَّایَ نَعَمَ بْنِ عَوْفٍ وَ نَعَمَ بْنِ عَفَّانَ فَاِنَّهُمَا اِنْ تَهْلِكْ مَا شِيَتُهُمَا يَرْجِعَانِ اِلَى الْمَدِيْنَةِ اِلٰى زَرْعٍ وَ نَخْلٍ، وَ اِنَّ رَبَّ الصُّرَيْمَةِ وَالْغُنَيْمَةِ اِنْ تَهْلِكْ مَا شِيَتُهُ يَأْتِنِىْ بِبَنِيْهِ فَيَقُوْلُ يَا اَمِيْرَ الْمُؤْمِنِيْنَ يَا أَمِيْرَ الْمُؤْمِنِيْنَ أَفَتَارِكُهُمْ أَنَا لَا أَبَالَكَ فَالْمَاءُ وَالْكَلَأُ أَيْسَرُ عَلَيَّ مِنَ الذَّهَبِ وَالْوَرِقِ وَاَيْمُ اللّٰهِ اِنَّهُمْ لَيَرَوْنَ اَنْ قَدْ ظَلَمْتُهُمْ اِنَّهَا لَبِلَادُهُمْ وَمِيَاهُهُمْ قَاتَلُوْا عَلَيْهَا فِى الْجَاهِلِيَّةِ وَاَسْلَمُوْا عَلَيْهَا فِى الْاِسْلَامِ وَالَّذِىْ نَفْسِىْ بِيَدِهِ لَوْ لَا الْمَالُ الَّذِىْ اَحْمِلُ عَلَيْهِ فِىْ سَبِيْلِ اللّٰهِ مَا حَمَيْتُ عَلَيْهِمْ مِنْ بِلَادِهِمْ شِبْرًا.

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

زید بن اسلم اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ نے اپنے آزاد کردہ غلام، جس کا نام 'ھُنَیی' تھا، کو سرکاری چراگاہ پر مقرر کیا تو آپ نے فرمایا کہ اے ھنیی، لوگوں کو اپنے بازو سے بچا کے رکھیو اور مظلوم کی بددعا سے ڈرتے رہیو، کیونکہ مظلوم کی دعا خدا کے ہاں مقبول ہے۔ چھوٹے گلے والوں اور بکریوں کے چھوٹے ریوڑ والوں کو ضرور داخل ہونے دینا، البتہ ابن عفان اور ابن عوف کے گلے آئیں تو ان کو روکنا، کیونکہ اگر ان کے مواشی ہلاک ہو گئے تو وہ مدینہ میں اپنے کھیتوں اور اپنے کھجور کے باغوں میں آ جائیں گے اور اگر چھوٹے گلے اور چھوٹے ریوڑ والے کا مال ہلاک ہو گیا تو وہ اپنے بچوں کے ساتھ میرے پاس آئیں گے اور کہیں گے کہ اے امیر المومنین، اے امیر المومنین، تو کیا میں ان کو چھوڑ دوں گا؟ خدا کے بندے، سوچو تو سہی۔ پانی اور چارہ مہیا کرنا میرے لیے زیادہ سہل ہے بمقابلہ اس کے کہ میں ان کے اوپر سونا اور چاندی خرچ کروں۔ خدا کی قسم، وہ خیال کریں گے کہ میں نے ان کے اوپر ظلم ڈھایا ہے۔ یاد رکھو کہ یہ ملک ان کا ہے۔ چشمے ان کے ہیں۔ اس کے اوپر جاہلیت کے دور میں انھوں نے جنگیں لڑی ہیں اور اس کے اوپر ہی وہ اسلام لائے ہیں۔ اس خدا کی قسم جس کی مٹھی میں میری جان ہے کہ اگر ان جانوروں کی ضرورت نہ ہوتی جن کے اوپر میں لوگوں کو اللہ

کے راستے میں سوار کراؤں تو میں ان کی زمین میں سے ایک بالشت برابر بھی چراگاہ نہ بناتا۔

وضاحت

'الحمی' سے مراد وہ سرکاری چراگاہیں ہیں جو حکومت نے جگہ جگہ صدقہ کے جانوروں کی حفاظت اور دیکھ بھال کے لیے بنا رکھی تھیں۔

'صُرَیْمَة' سے مطلب اونٹوں کا چھوٹا گلہ اور 'غُنَیْمَة' سے مراد بکریوں کا چھوٹا ریوڑ ہے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں ہزاروں گھوڑے، اونٹ اور گائے صدقے کے تھے جنھیں ان چراگاہوں میں رکھا گیا تھا، اور ان کے اوپر ان کی دیکھ بھال کے لیے آدمی مقرر تھے۔ ایک روز آپ نے اپنے آزاد کردہ غلام کو جسے سرکاری چراگاہ پر مقرر کیا تھا، بلا کر تلقین کی کہ اپنے ہاتھ کو لوگوں پر ظلم کرنے سے روک کر رکھے، کیونکہ مظلوم کی دعا اللہ تعالیٰ کے ہاں فوراً سنی جاتی ہے۔ انھوں نے ہدایت فرمائی کہ چھوٹے گلہ والے، یعنی غربا اگر اپنے گلے لائیں تو ان کو چراگاہوں سے نہ روکا جائے، کیونکہ ان ہی نے اپنی زمینوں کے لیے جاہلیت کے زمانے میں جنگیں لڑی ہیں اور ان ہی زمینوں کے اوپر وہ اسلام لائے ہیں تو میں کس طریقہ سے ان کے پانی اور ان کے چارے کو روک سکتا ہوں۔ البتہ جو لوگ رئیس ہیں اگر ان کے گلے آئیں تو ان کو تم روک سکتے ہو۔ جنگیں تو ان رئیسوں نے بھی لڑی ہیں، مگر ان کے پاس متبادل وسائل کھیت اور باغ کی شکل میں موجود ہیں۔ ان کے لیے مویشیوں کی دیکھ بھال مشکل نہیں۔ اگر ان کا مال ہلاک ہو جائے تو وہ اس نقصان کو برداشت کر لیں گے اور وہ مدینہ میں اپنے کھیتوں اور باغوں میں آ جائیں گے۔

اللہ کے راستے میں سوار کرانے سے مراد وہ اونٹ اور گھوڑے ہیں جو اللہ کی راہ میں جہاد کرنے کے لیے مجاہدین کو مہیا کیے جاتے تھے۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.org

امام حمید الدین فراہی

شان نزول

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

شان نزول کا مطلب، جیسا کہ بعض لوگوں نے غلطی سے سمجھا ہے، یہ نہیں ہے کہ وہ کسی آیت یا سورہ کے نزول کا سبب ہوتا ہے، بلکہ اس سے مراد لوگوں کی وہ حالت و کیفیت ہوتی ہے جس پر وہ کلام برسر موقع حاوی ہوتا ہے۔ کوئی سورہ ایسی نہیں ہے جس میں کسی خاص امر یا چند خاص امور کو مدنظر رکھے بغیر کلام کیا گیا ہو، اور وہ امر یا امور جن کو کسی سورہ میں مدنظر رکھا جاتا ہے، اس سورہ کے مرکزی مضمون کے تحت ہوتے ہیں۔ لہٰذا اگر تم کو شان نزول معلوم کرنی ہو تو اس کو خود سورہ سے معلوم کرو، کیونکہ کلام کا اپنے موقع و محل کے مناسب ہونا ضروری ہے۔ جس طرح ایک ماہر طبیب دوا کے نسخہ سے اس شخص کی بیماری معلوم کر سکتا ہے جس کے لیے نسخہ لکھا گیا ہے، اسی طرح تم ہر سورہ سے اس سورہ کی شان نزول معلوم کر سکتے ہو۔ اگر کلام میں کوئی خاص موضوع پیش نظر ہے تو اس کلام اور اس موضوع میں وہی مناسبت ہو گی جو مناسبت لباس اور جسم میں، بلکہ جلد اور بدن میں ہوتی ہے۔ اور یہ قطعی ہے کہ کلام کے تمام اجزا باہم دگر مربوط و متصل ہوں گے۔ اور یہ جو روایتوں میں آتا ہے کہ فلاں فلاں آیتیں فلاں فلاں معاملات کے بارہ میں نازل ہوئیں تو اس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ سورہ کے نزول کے وقت یہ یہ احوال و مسائل درپیش تھے تاکہ معلوم ہو سکے کہ سورہ کے نزول کے لیے کیا محرکات اور اسباب موجود تھے۔ علامہ سیوطی فرماتے ہیں:

”زرکشی نے برہان میں لکھا ہے کہ صحابہ و تابعین رضی اللہ عنہم کی یہ عام عادت ہے کہ جب وہ کہتے ہیں کہ فلاں آیت فلاں بارہ میں نازل ہوئی تو اس کا مطلب یہ ہوا کرتا ہے کہ وہ آیت اس حکم پر مشتمل ہے۔ یہ مطلب نہیں ہوتا کہ بعینہٖ وہ بات اس آیت کے نزول کا سبب ہے۔ یہ گویا اس حکم پر اس آیت سے ایک قسم کا استدلال ہوتا ہے، اس

سے مقصود نقل واقعہ نہیں ہوتا۔ میں کہتا ہوں کہ اسباب نزول میں ایک قابل لحاظ چیز یہ بھی ہے کہ ضروری نہیں کہ آیت اسی زمانہ میں نازل ہوئی ہو جس زمانہ میں واقعہ پیش آیا۔'' (الاتقان فی علوم القرآن ۱/ ۹۳)

زرکشی کے اس بیان سے وہ مشکل حل ہو جاتی ہے جس کا ذکر امام رازی نے سورۂ انعام میں 'وَاِذَا جَآءَكَ الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِاٰيٰتِنَا* الايه' کی تفسیر کے ذیل میں کیا ہے۔ وہاں امام رازی فرماتے ہیں:

''مجھے یہاں ایک سخت اشکال پیش آیا ہے، وہ یہ کہ لوگ اس امر پر متفق ہیں کہ یہ پوری سورہ بیک دفعہ نازل ہوئی تھی۔ اگر صورت معاملہ یہ ہے تو پھر ہر آیت کے بارہ میں یہ کہنا کیسے صحیح ہو سکتا ہے کہ اس کا سبب نزول فلاں واقعہ ہے۔'' (التفسیر الکبیر، رازی ۱۳/ ۳)

پس ہمارے نزدیک، جیسا کہ اوپر کے مباحث سے واضح ہوا، صورت معاملہ یہ ہے کہ جس وقت جو سورہ بھی نازل کی گئی ہے، وہ اس غرض کے لیے نازل کی گئی ہے کہ جو معاملات محتاج توضیح و تشریح ہیں، ان کی توضیح و تشریح کر دی جائے اور کلام ایسا ہو کہ اس کے نظم میں کسی قسم کا التباس و ابہام نہ ہو۔ جس طرح ایک ماہر اور حکیم خطیب اپنے سامنے کے خاص حالات و مقتضیات کی بنا پر ایک خطبہ دیتا ہے کہ بسا اوقات وہ ایک خاص معاملہ کا ذکر اگرچہ نظر انداز کر دیتا ہے، لیکن اس کا کلام اس طرح کے تمام احوال و معاملات پر حاوی ہوتا ہے، اور کبھی ایسا ہوتا ہے کہ وہ ذکر تو کسی خاص معاملہ یا کسی خاص شخص کا کرتا ہے، لیکن کلام ایک عالم گیر بارش کی طرح بالکل عام و ہمہ گیر ہوتا ہے۔ اسی طرح قرآن حکیم کا نزول بھی ہوا ہے جیسا کہ قرآن مجید سے خود مترشح ہوتا ہے۔ چنانچہ فرمایا ہے: 'وَاِنْ تَسْئَلُوْا عَنْهَا حِيْنَ يُنَزَّلُ الْقُرْاٰنُ تُبْدَلَكُمْ'** (اور اگر تم ان کے متعلق ایسے وقت میں سوال کرو گے، جبکہ قرآن نازل ہو رہا ہے تو وہ ظاہر کر دی جائیں گی)۔ اس سے معلوم ہوا کہ قرآن عین اپنے وقت میں سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے، لوگوں کے سوالوں کے جواب دے دیتا تھا۔ اس طرح جب ایک سورہ اپنی حد کو پہنچ جاتی اور کلام کے تمام تقاضے پورے ہو جاتے تو وہ سورہ تمام کر دی جاتی اور ناممکن تھا کہ وہ اپنے حدود اقتضا سے ذرا بھی کم و بیش ہو۔

لیکن بسا اوقات ضرورت باقی رہ جاتی تھی تو اس وقت دوسری سورہ نازل کی جاتی۔ شان نزول وہی ہوتی، لیکن اسلوب میں تبدیلی کر دی جاتی تاکہ یکسانی و یک رنگی سننے والوں کی طبیعت پر بار نہ ہو۔ یہی وجہ ہے کہ ابتداے بعثت کی بہت سی سورتوں میں حشر و نشر، توحید، تصدیق رسول اور اس سے ملتے جلتے ہوئے مضامین ملتے ہیں، صرف اسلوب اور طرز بیان کا فرق ہے۔ اسی طرح کبھی ایسا ہوتا کہ ضرورت کسی امر کی توضیح و تشریح کی داعی ہوتی، اس وقت کوئی

* ۶: ۵۴۔

** المائدہ ۵: ۱۰۱۔

آیت اترتی اور جہاں ضرورت ہوتی، وہ آیت وہیں رکھ دی جاتی۔ یہ اس وعدہ کی تکمیل ہوتی جس کا ذکر سورۂ قیامہ میں فرمایا ہے: 'ثُمَّ اِنَّ عَلَيۡنَا بَيَانَهٗ*' (پھر ہمارے ذمہ ہے اس کی توضیح کرنا)۔ ایسے مواقع پر زمانۂ نزول کا لحاظ نہ ہوتا، بلکہ نظم کلام کا لحاظ کیا جاتا اور بالعموم اس قسم کی آیات کے بعد یہ تنبیہ بھی کر دی جاتی کہ یہ آیت بطور تشریح نازل ہوئی ہے۔ چنانچہ جو آیتیں اصل احکام کے ساتھ بطور تفسیر ملائی گئی ہیں، ان کے بعد بالعموم، جیسا کہ ہم نے دیباچہ میں ذکر کیا ہے، یہ آیت آئی ہے: 'كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ اٰيٰتِهٖ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمۡ يَتَّقُوۡنَ**' (اسی طرح اللہ اپنی آیتوں کو لوگوں کو سمجھانے کے لیے کھولتا ہے تاکہ وہ تقویٰ اختیار کریں)۔

پس اگر تم طمانیت اور یقین کے طالب ہو تو شان نزول کی تلاش میں سر رشتۂ نظم کو ہرگز ہاتھ سے نہ چھوڑنا، ورنہ تمھاری مثال صحرا کے اس مسافر کی ہو جائے گی جو اندھیری رات میں ایک چوراہے پر پہنچ گیا ہے اور نہیں جانتا کہ اب کدھر جائے۔ شان نزول خود قرآن کے اندر سے اخذ کرنی چاہیے اور احادیث و روایات کے ذخیرہ میں سے صرف وہ چیزیں لینی چاہییں جو نظم قرآن کی تائید کریں نہ کہ اس کے تمام نظام کو درہم برہم کر دیں۔ پھر سب سے زیادہ لائق اہتمام وہ شان نزول ہے جو خود نظم قرآن سے مترشح ہو رہی ہے۔ اس کو پوری مضبوطی سے پکڑو، کیونکہ جب کوئی حکم عام کسی خاص حالت و صورت میں نازل ہوتا ہے تو وہ حالت و صورت اس حکم کی حکمت و علت کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ مثلاً قرآن میں تعدد ازواج اور وحدت ازواج، دونوں کا حکم ہے۔ اب اگر تم اس شان نزول کو سامنے رکھو جو نظم کلام سے نکلتی ہے تو تمھیں معلوم ہوگا کہ پہلا حکم یتامیٰ*** کے ساتھ انصاف کے مقصد سے ہے اور دوسرا حکم بیویوں کے ساتھ انصاف کے مقصد سے ہے اور ان دونوں کے درمیان، جامع رشتہ قسط بالضعفاء، یعنی کمزوروں کے ساتھ انصاف ہے، اور ان میں سے ترجیح اس حق کو ہوگی جو مقدم ہے۔ یہی حال رہن کے معاملہ کا ہے۔ کسی مسلمان کا مال گرو رکھنا ایک نہایت دناءت کی بات ہے۔ پس ضرورت کے لیے اس کی اجازت دی اور ضرورت رفع ہو جانے کے بعد اس کے لوٹا دینے کا حکم دیا۔ اس اجمالی اشارہ کی تفصیل بقرہ کی آیت ۲۸۳ کے تحت ملے گی۔

---

* القیامہ ۷۵: ۱۹۔

** البقرہ ۲: ۱۸۷۔

*** بعض مرتبہ یتیموں کی پرورش یا اس قسم کی کوئی دوسری معاشرتی یا اخلاقی و اجتماعی مصلحت کا تقاضا ہوتا ہے کہ آدمی ایک سے زیادہ بیویاں رکھے۔ (مترجم)

امین احسن اصلاحی

جدید فلسفہ و سائنس سے مرعوبیت کے اثرات

مغربی اقوام کی سائنس اور ان کے فلسفہ سے ہماری مرعوبیت یوں تو پہلے بھی کچھ کم نہ تھی، لیکن جب سے روس اور امریکا نے چاند پر کمند اندازی اور چاند ماری شروع کی ہے، اس وقت سے تو یہ مرعوبیت اس تیزی کے ساتھ بڑھ رہی ہے کہ اس تیزی کا مقابلہ شاید وہ راکٹ بھی نہ کر سکیں جو روس اور امریکا کی طرف سے چاند پر پھینکے جا رہے ہیں۔ یہ مرعوبیت ایک بالکل فطری اور قدرتی چیز ہے۔ جو قومیں زندگی کی بھاگ دوڑ، اسباب زندگی کی فراہمی اور وسائل فتح و تسخیر کی ایجاد میں پیچھے رہ جاتی ہیں، وہ لازمی طور پر اپنے سے برتر قوموں سے مرعوب رہتی ہیں۔ اس مرعوبیت کا علاج نہ بے جا فخاری سے ممکن ہے اور نہ اندھی بہری تقلید سے، اگر ممکن ہے تو صرف اس طرح ممکن ہے کہ ہمارے نوجوانوں کے اندر بھی علم و تحقیق اور ایجاد و اختراع کا ذوق وشوق پیدا ہو، اور ان کے اس ذوق وشوق کی حوصلہ افزائی اور اس کو پروان چڑھانے کے لیے ضروری اسباب و وسائل انھیں بھی حاصل ہوں۔ لیکن یہ ہماری بدقسمتی ہے کہ غیروں سے آزادی حاصل کرنے کے باوجود اپنی ذہنی و عقلی قوتوں کو پروان چڑھانے والی فضا اب تک ہم خود اپنے ماحول میں پیدا نہ کر سکے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ یہ مرعوبیت روز بروز بڑھتی ہی جا رہی ہے اور اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ یہ کس حد پر جا کر رکے گی۔

اس مرعوبیت کا سب سے زیادہ افسوس ناک پہلو یہ ہے کہ ہمارے نوجوانوں اور ہمارے تعلیم یافتہ طبقہ میں اپنی روایات کی مخالفت اور اپنے مذہب سے بے زاری بطور فیشن کے ترقی پکڑ رہی ہے۔ بطور فیشن کے ترقی پکڑنے کا مطلب یہ ہے کہ اس مخالفت اور بے زاری کی بنیاد کسی علم و تحقیق پر نہیں ہے، بلکہ مجرد احساس کہتری اور انفعال پر ہے۔ یہ نہیں ہوا ہے کہ غور و فکر اور تحقیق و تنقید سے ان پر ایک عقیدہ کی غلطی اور دوسرے نظریہ کی صحت ثابت ہو گئی ہے، اس وجہ

سے وہ ایک کورد اور دوسرے کو اختیار کر رہے ہیں۔ اگر یہ بات ہوتی تو خواہ یہ کتنی ہی غلط ہوتی ہمارے نزدیک زیادہ تشویش انگیز نہیں تھی۔ تشویش انگیز بات یہ ہے کہ محض اس وہم نے کہ جو قومیں سائنس کے میدان میں ہم سے برتر ہیں، لازماً مذہب و شریعت میں بھی وہ ہم سے برتر ہیں، بہتوں کے اندر یہ رجحان پیدا کر دیا ہے کہ وہ اپنی روایات کی مخالفت کریں اور دوسروں کی روایات کو سراہیں۔ بدقسمتی سے چونکہ عام طور پر اس طبقہ کے اندر اپنے مذہب کا علم محض روایتی ہی تھا، اس کی گہری بنیاد نہیں تھی، اس وجہ سے ہم دیکھ رہے ہیں اور ہر آنکھیں رکھنے والا شخص دیکھ سکتا ہے کہ جس طرح جنگل کی آگ پھیلا کرتی ہے، اسی طرح ہمارے کالجوں ہماری یونیورسٹیوں، اور ہمارے جدید تعلیم یافتہ طبقہ میں الحاد کی یہ آگ بھی پھیل رہی ہے۔

مرعوب ذہن کا یہ خاصہ ہے کہ وہ جس سے مرعوب ہو جاتا ہے، اس کی تقلید کرتا ہے اور یہ تقلید عموماً اندھی بہری ہوتی ہے۔ علامہ ابن خلدون نے تو اس باب خاص میں ایک عجیب و غریب نفسیاتی راز کا بھی انکشاف کیا ہے۔ اس نے اپنے مقدمہ میں مرعوب قوموں کی نفسیات بیان کرتے ہوئے یہ لکھا ہے کہ مرعوب قومیں عموماً غالب قوموں کی تقلید ان کی خوبیوں میں نہیں کیا کرتیں، بلکہ ان کی کمزوریوں اور برائیوں میں ان کی تقلید کیا کرتی ہیں۔ اس کی وجہ وہ یہ بیان کرتا ہے کہ خوبیوں میں غالب کی تقلید کرنا عزم و ہمت کا کام ہے اور عزم و ہمت کے کسی کام کا حوصلہ بھلا مرعوبوں میں کہاں؟ البتہ وہ ان کے فیشن اور ان کے بعض ظاہری عادات و رسوم میں ان کی نقالی کر کے اپنے آپ کو یہ مغالطہ دینے کی کوشش کرتی ہیں کہ ترقی کے جو اسرار غالب کے پاس تھے، ان کی کلید اب ان کے ہاتھ بھی لگ گئی ہے۔

ابن خلدون کے اس فلسفہ کی سچائی کی تصدیق جس خوبی کے ساتھ خود ہمارا اجتماعی کردار کر رہا ہے، وہ نصیحت آموزی کے لیے کافی ہے۔ جب انگریز ہم پر حاوی ہوئے تو اس میں شبہ نہیں کہ ان کے انفرادی و اجتماعی کردار کے کچھ نہایت روشن پہلو بھی تھے جو ان کو ہم پر غالب کرنے کا سبب ہوئے تھے۔ اگر ہم ان کے کردار کے ان روشن پہلوؤں پر نگاہ جماتے اور ان کی ان خوبیوں کو اپنے اندر پیدا کرنے کی کوشش کرتے تو اس طرح ہم ان کے غلبہ اور اپنی شکست سے صحیح سبق حاصل کرنے والے بنتے اور اپنے اخلاقی ورثہ کو جو ہم ہی نے ان کی طرف منتقل کیا تھا، گویا دوبارہ ان سے واپس لیتے۔ لیکن بدقسمتی سے اس معاملہ میں ہم نے وہی غلط روش اختیار کی جس کی طرف ابن خلدون نے اشارہ کیا ہے، یعنی ہم میں سے بہتوں نے یہ سمجھا کہ انگریز کا اصلی کمال یہ ہے کہ وہ ٹانگوں میں پتلون ڈال کر چلتا ہے، سر پر ہیٹ لگاتا ہے، شراب پیتا ہے، بال روم میں جا کر ناچتا ہے اور اپنی عورتوں کو نیم عریاں حالت میں ہر مجلس میں پھراتا ہے۔ اس غلط فہمی کا اثر یہ ہوا کہ انگریزوں کی خوبیاں تو ہمارے اندر پیدا نہ ہو سکیں، البتہ ہماری قوم کے ایک طبقہ نے

ان کی برائیاں بڑے اہتمام سے اور کافی پیسے خرچ کر کے اپنے اندر جمع کر لیں اور اس طرح اس نے اپنی قدیم طرز کی بہت سی برائیوں کے اوپر جدید طرز کی کچھ برائیوں کا بھی اضافہ کر لیا اور جب یہ نئی ولایتی بلا گھر میں داخل ہو گئی تو قدرتی طور پر خود اپنی قدیم طرز کی تہذیب و روایت کی کچھ اچھی چیزیں جو دست برد زمانہ سے بچ بچا کر ہمارے گھروں کے گوشوں اور کونوں میں دبی دبائی پڑی ہوئی تھیں، وہ بھی رخصت ہو گئیں۔

آزادی کے حصول کے بعد ہونا تو یہ تھا کہ یہ مرعوبیت کچھ کم ہوتی، لیکن افسوس ہے کہ یہ چیز نہ صرف یہ کہ کم نہیں ہوئی، بلکہ جیسا کہ ہم نے عرض کیا، یہ چیز بڑھی ہے اور برابر بڑھتی جا رہی ہے۔ اس کا اثر ہماری انفرادی و اجتماعی زندگی کے ہر گوشہ میں نمایاں ہو رہا ہے، خاص کر ہمارا وہ جدید تعلیم یافتہ طبقہ اس مرعوبیت کا بری طرح شکار ہو رہا ہے جو ہماری قومی و ملی آرزوؤں کا اصلی مرکز و محور خیال کیا جاتا ہے۔ یہ لوگ عام طور پر امریکا یا روس کو بطور ایک نمونہ اور مثال کے اپنے سامنے رکھتے ہیں اور اس عقیدت کے ساتھ سامنے رکھتے ہیں کہ خود ان کا اپنا ماضی ان کی نگاہوں سے بالکل اوجھل ہو گیا ہے۔ اس عقیدت کے غلو نے ان لوگوں کو برائی اور بھلائی میں امتیاز سے بھی بالکل محروم کر دیا ہے، یہ آنکھ بند کر کے ان سب چیزوں کو اختیار کرنے میں ایک دوسرے پر سبقت کر رہے ہیں جو ان قوموں کے اندر ان کو چمکتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ اس سے بحث نہیں کہ یہ چیزیں مضر ہیں یا مفید۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

اس حقیقت کا ایک واضح ثبوت ہماری قوم کے ان طلبہ اور طالبات کے کردار سے بھی ملتا ہے جو امریکا یا انگلستان تعلیم کے لیے جاتے یا بھیجے جاتے ہیں، ہر شخص جانتا ہے کہ ان ملکوں میں تعلیم کے لیے جانے اور بھیجنے کا اگر کوئی فائدہ ہے تو یہی ہے کہ ان ملکوں نے سائنس کے مختلف شعبوں میں جو حیرت انگیز ترقیاں کی ہیں، ان کی تعلیم ہماری قوم کے نوجوان بھی حاصل کریں اور ان چیزوں کو سیکھ کر جب وہ واپس آئیں تو پوری محنت اور جاں فشانی کے ساتھ ان کو اپنے ملک میں بھی رائج کریں، تاکہ ان کا پس ماندہ ملک بھی ترقی یافتہ ملکوں کی صف میں کھڑا ہو سکے، لیکن ان نوجوانوں کے تعلیمی و تحقیقی مشاغل سے متعلق جو تفصیلات وقتاً فوقتاً اخبارات و رسائل میں نکلتی رہتی ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ ہماری قوم کے یہ نوجوان، جن پر ہماری مستقبل کی بہت سی امیدوں کا انحصار ہے، اپنی اسی نفسیاتی بیماری کے سبب سے، جس کی طرف ہم نے اشارہ کیا ہے، اس ماحول میں پہنچ کر اس بری طرح تباہ ہوتے ہیں کہ اس قسم کی تباہی کسی بد قسمت قوم ہی کے حصہ میں آ سکتی ہے۔ جو مرعوبیت وہ یہاں سے ساتھ لے کر جاتے ہیں، وہ وہاں پہنچ کر انھیں وہ ٹھوکر کھلاتی ہے کہ انھیں کچھ ہوش ہی نہیں رہ جاتا کہ کیا کرنے آئے تھے اور کیا کر چلے ہیں۔

ضرورت تھی کہ ہماری قوم کے اہل فکر اس مرعوبیت کو دور کرنے کی کوشش کرتے تاکہ ہمارے نوجوان ذہنی توازن

اور خیر وشر میں امتیاز کے ساتھ ان قوموں کے علم وفلسفہ سے استفادہ کر سکتے، لیکن اس مرعوبیت ہی کا ایک نہایت گھناؤنا پہلو یہ ہے کہ ہمارے اندر ایسے ایسے مفسر پیدا ہو گئے ہیں جو اپنے زعم کے مطابق قرآن سے یہ ثابت کر رہے ہیں کہ قرآن نے جن لوگوں کو آیت 'اِنَّمَا یَخۡشَی اللّٰہَ مِنۡ عِبَادِہِ الۡعُلَمٰٓؤُا'* (اللہ سے اس کے بندوں میں سے علما ہی ڈرتے ہیں) میں علما کہا ہے، اس سے مراد یہی سائنٹسٹ اور کائناتی مفکر ہیں جو طبیعات، نباتات، حیوانات، طبقات الارض اور فضائیات کے اسرار پر غور کرتے ہیں، اس لیے کہ خدا کی عظمت و ہیبت کا اندازہ وہی لوگ کر سکتے ہیں۔ یہی لوگ ہیں جو اولوالالباب ہیں، اس لیے کہ یہ لوگ سمع وبصر اور فوأد سے کام لے رہے ہیں اور کائنات میں غور وفکر کرتے ہیں۔ یہی لوگ مومن ومتقی ہیں، اس لیے کہ قرآن میں مومنین ومتقین کی تعریف یہ بیان کی گئی ہے کہ وہ کائنات کے متعلق تحقیق وتدقیق کے بعد رموز فطرت کی عقدہ کشائی کرتے ہیں۔ پھر یہی لوگ اہل جنت ہیں، اس لیے کہ قرآن نے فقر و غربت کی زندگی کو عذاب سے تعبیر کیا ہے اور رزق کی فراوانی قرآن میں جنت کی خاص خصوصیت بیان کی گئی ہے۔

اس قسم کی مہمل باتیں جو بعض رسالوں میں نکل رہی ہیں، یہ سب اسی مرعوب ذہن کی غمازی کر رہی ہیں جس کی طرف ہم نے اشارہ کیا ہے۔ ہر شخص خواہ اس کو قرآن کا کچھ علم ہو یا نہ ہو، اس بات کو سمجھ سکتا ہے کہ قرآن دنیا کے ملحدین ومنکرین کو سند فضیلت بانٹنے کے لیے نہیں آیا ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ طبیعات، نباتات، طبقات الارض اور فضائیات کے اسرار وقوانین پر غور وفکر اور ان کا اکتشاف قرآن کی نگاہوں میں نہایت اعلیٰ درجہ کا کام ہے، لیکن جو سائنٹسٹ اور کائناتی مفکر اتنے کوڑھ مغز اور بے بصیرت ہیں کہ انھیں خدا کی اس کائنات کے اتنے عجائب دیکھنے کے بعد بھی خدا کہیں نظر نہیں آتا۔ قرآن کے نزدیک وہ علما نہیں، بلکہ جہلا اور حمقا ہیں۔ اسی طرح سمع وبصر اور فوأد سے کام لینا اور ان کو ان کے مقاصد میں استعمال کرنا قرآن کے نزدیک انسانی سعادت کے فتح باب کی کلید ہے، لیکن اگر یہ سمع و بصر سب کچھ دیکھیں اور سب کچھ سنیں، لیکن اسی کو نہ دیکھ سکیں جو سب سے زیادہ آشکارا اور اسی ندائے غیب کو نہ سن سکیں جو سب سے زیادہ بلند اور رعد آسا ہے تو قرآن کے نزدیک یہ کان بہرے اور یہ آنکھیں اندھی ہیں۔ علیٰ ہٰذا القیاس کائنات کے اسرار کی جستجو اور رموز فطرت کی عقدہ کشائی کا ذوق ایمان کے دروازے کی کلید ہے، لیکن جس جستجو کا مطلوب خدا نہ ہو اور جو عقدہ کشائی ایمان بالآخرت کی طرف رہبری کرنے والی نہ ہو، قرآن کے نزدیک یہ جستجو ہرزہ گردی اور یہ عقدہ کشائی بادپیمائی ہے۔ ٹھیک اسی طرح روٹی اللہ تعالیٰ کی بہت بڑی نعمت ورحمت ہے، بشرطیکہ یہ جن کو ملے، وہ شکرگزاری کے جذبہ اور اطاعت الٰہی کے مقصد کے ساتھ کھائیں اور کھلائیں، لیکن اگر خدا یہ روٹی اور اس کے

* فاطر ۳۵: ۲۸۔

سارے لوازم ان لوگوں کو دے جو اس کے باغی اور نافرمان ہیں اور وہ اسی جذبہ اور اسی مقصد کے ساتھ اس روٹی کو کھائیں بھی تو یہ روٹی خدا کی رحمت نہیں ہے، بلکہ اس کی طرف سے ایک لعنت ہے جس کے پیچھے اللہ تعالیٰ کا عذاب چھپا ہوتا ہے۔

یہ باتیں قرآن مجید میں اس قدر واضح ہیں کہ ممکن نہیں ہے کہ کوئی شخص قرآن کا ایمان و اسلام کے ساتھ ایک مرتبہ بھی مطالعہ کرے اور اس کی ہر سورہ میں اس کے یہ حقائق اس کے سامنے بالکل بے نقاب ہو کر نہ آئیں۔ اس کے باوجود اگر کوئی شخص قرآن مجید کی طرف اس طرح کے مزخرفات منسوب کرتا ہے تو اس کی وجہ یہ تو ہرگز نہیں ہو سکتی کہ خدانخواستہ قرآن میں ان چیزوں کے لیے کوئی گنجایش موجود ہے، بلکہ اس کی وجہ وہی ہے جس کی طرف ہم نے آغاز مضمون میں اشارہ کیا ہے، یعنی ہمارے اندر بہت سے ایسے لوگ پیدا ہو گئے ہیں جو روس اور امریکا وغیرہ سے اس درجہ مرعوب ہیں کہ انھیں ہر چیز اب انھی کی پسند آتی ہے اور یہ بیماری ان کے اندر اس حد تک بڑھ گئی ہے کہ ان کی خواہش یہ ہے کہ قرآن بھی اپنے ہر پارے اور اپنی ہر سورہ میں روس اور امریکا ہی کی تعریف و توصیف کرتا نظر آئے اور اگر ان کی یہ خواہش پوری ہوتی نظر نہیں آتی تو وہ کوشش کر کے قرآن کی آیتوں کو وہ معنی پہنا دیتے ہیں جو ان کے اپنے دل میں ہوتے ہیں۔

اس قسم کے خیالات اگر کسی حلقہ میں مقبولیت حاصل کرتے ہیں تو اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ ان خیالات کے لیے قرآن سے بزعم خویش جو دلیلیں فراہم کی جاتی ہیں، وہ بڑی موثر اور دل نشیں ہوتی ہیں۔ آخر اتنا سادہ لوح کون ہو سکتا ہے جو یہ مان لے کہ قرآن فی الواقع انھی ملحدین و بے دین سائنس دانوں کو اولوا الالباب اور علما کے القاب سے نوازتا ہے یا انھی فساق و فجار کو مومن و متقی قرار دیتا ہے۔ ان باتوں کو سب ہی لایعنی سمجھتے ہیں، لیکن اگر ایک چیز کو ان کا دل چاہتا ہے اور ایک دوسرا شخص ان کو یہ اطمینان دلا دیتا ہے کہ یہ جو کچھ تم چاہ رہے ہو، ٹھیک یہی قرآن کی تعلیم بھی ہے تو آخر اس کے قبول کر لینے میں کیا خرابی ہے؟ یہ چیز ایک دھوکا اور مغالطہ سہی، لیکن دھوکا اور مغالطہ اپنی خواہشوں کے مطابق ہے، اس میں پڑ جانے میں کیا حرج ہے! بس اس قسم کے احمقانہ خیالات کے تحت بہت سے لوگ ان مزخرف باتوں کی تائید و تشہیر شروع کر دیتے ہیں تاکہ لوگوں پر یہ دھونس جما سکیں کہ وہ جو کچھ کر رہے ہیں حرف بحرف قرآن کے احکام کی تعمیل میں کر رہے ہیں۔

درحقیقت غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ ان کی یہ خواہش بھی ان کی مرعوبیت ہی کا ایک پہلو ہے۔ ایک طرف روس اور امریکا سے ان کی مرعوبیت انھیں مجبور کرتی ہے کہ یہ انھی کے فکر و عمل کو ہر پہلو سے سراہیں اور آنکھیں بند کر کے کم از کم بے قیدی و آزادی اور لذات نفس کے حد تک ان کی پیروی کریں، دوسری طرف اپنی روایات اور اپنے مذہب سے جو

مرعوبیت وراثۃً انھیں ملی ہے، وہ تقاضا کرتی ہے کہ جو جرم بھی وہ کریں، اس کی تائید وحمایت میں کسی نہ کسی طرح مذہب کو بھی کھڑا کرلیں۔ضمیر اور راے کی آزادی نہ ان بیچاروں کو روس اور امریکا کی عقیدت اور نیاز مندی کے معاملہ میں حاصل ہے اور نہ قرآن کے ساتھ اظہار وفاداری کے معاملہ میں۔ یہ روس اور امریکا کے مرید ہیں،لیکن صرف ان کی لذت پرستیوں اور بے قیدیوں کے حد تک،ان کی اولوالعزمیوں میں ساتھ دینے کے عزم وحوصلہ کا اب تک انھوں نے کوئی ثبوت فراہم نہیں کیا ہے۔اسی طرح یہ قرآن کے ساتھ بھی وفاداری کا دم بھرتے ہیں،لیکن صرف اسی حد تک جس حد تک اس کو کھینچ تان کر اپنی خواہشوں کے مطابق بنا سکیں۔مخلص اور جری یہ کسی کے معاملہ میں بھی نہیں ہیں۔نہ اپنے ارضی خداؤں کے معاملہ میں، نہ اپنے آسمانی خدا کے معاملہ میں۔

یہ مرعوبیت، ہمارے نزدیک اس وقت ہماری قوم کی سب سے بڑی بیماری ہے جس کا دور ہونا نہایت ضروری ہے۔ اس بیماری کے موجود ہوتے ہوئے ہم علم یا عمل کے کسی میدان میں بھی کوئی صحت مندانہ قدم کبھی نہیں اٹھا سکتے۔اس کا جوڑ ایک غلام قوم کے ساتھ تو ہوسکتا ہے،لیکن ایک آزاد قوم کے اندر، جو ایک اولوالعزم قوم کی طرح اپنے نظریات اور اپنی آئیڈیالوجی کے مطابق زندگی بسر کرنا اور ترقی کرنا چاہتی ہو،اس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ یہ بیماری اگر ہمارے اندر موجود ہے تو امریکا اور روس والے تو ممکن ہے چاند پر پہنچ سکیں یا نہ پہنچ سکیں،لیکن ہم تو تحت الثریٰ میں یقیناً پہنچ جائیں گے۔اس لیے قوم کے ہر بہی خواہ کا یہ فرض ہے کہ اس بیماری کو سمجھنے اور اس کو اپنی استعداد اور صلاحیتوں کے مطابق دور کرنے کی کوشش کرے۔ذہنی مرعوبیت کو دور کرنے کے لیے بے جا قسم کی فخاری اور حقائق سے چشم پوشی کوئی مفید چیز نہیں ہوسکتی۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ ہمیں ان قوموں سے بہت کچھ سیکھنا ہے جو زندگی کی جدوجہد میں ہم سے بہت آگے ہیں۔اگر ہم اس ضرورت کا احساس نہ کریں گے تو اس کا نتیجہ دوسروں کے حق میں نہیں، بلکہ خود ہمارے ہی حق میں مضر نکلے گا،لیکن جو کچھ سیکھنا ہے، وہ ہوش وتمیز کے ساتھ سیکھنا ہے،مرعوبانہ ذہنیت کے ساتھ آنکھیں بند کر کے ان کے پیچھے لگ جانا یا ان کی ہر غلط اور صحیح چیز میں ان کی نقالی کرنا نہیں ہے۔اگر وہ سائنس کی تحقیقات اور تجربات میں ہم سے آگے ہیں تو اس کے معنی ہرگز یہ نہیں ہیں کہ وہ مذہب وشریعت،تمدن ومعاشرت اور معیشت وسیاست کے اصولوں میں بھی ہم سے برتر ہیں۔اگر ہم اس غلط فہمی میں پڑ گئے تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ہم ان سے جتنا حاصل کریں گے،اس سے کئی گنا ان کے پیچھے لگ کر خود اپنا برباد کر دیں گے۔اس وجہ سے وقت کی یہ نہایت اہم ضرورت ہے کہ اس سوال پر غور کیا جائے کہ اس وقت اپنی قوم کی نئی نسل کو اس مرعوبیت سے بچانے اور اس کو صحیح راستہ پر لگانے کے لیے کیا تدبیریں اختیار کی جاسکتی ہیں؟

---

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

امین احسن اصلاحی

نبی صلی اللہ علیہ وسلم

بحیثیت ایک مدبر اور ماہر سیاست

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے سے اللہ تعالیٰ نے دنیا کے لیے جو دین بھیجا، وہ جس طرح ہماری انفرادی زندگی کا دین ہے، اسی طرح ہماری اجتماعی زندگی کا بھی دین ہے۔ جس طرح وہ عبادت کے طریقے بتاتا ہے، اسی طرح وہ سیاست کے آئین بھی سکھاتا ہے اور جتنا تعلق اس کا مسجد سے ہے، اتنا ہی تعلق اس کا حکومت سے بھی ہے۔ اس دین کو ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کو بتایا اور سکھایا بھی، اور ایک وسیع ملک کے اندر اس کو عملاً جاری و نافذ بھی کر دیا، اس وجہ سے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی جس طرح بحیثیت ایک مزکّی نفوس اور ایک معلم اخلاق کے ہمارے لیے اسوہ اور نمونہ ہے، اسی طرح بحیثیت ایک ماہر سیاست اور ایک مدبر کامل کے بھی اسوہ اور مثال ہے۔

اس امر واقعی سے ہر شخص واقف ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پہلے عرب قوم سیاسی اعتبار سے ایک نہایت پست حال قوم تھی۔ مشہور مؤرخ علامہ ابن خلدون نے تو ان کو ان کے مزاج کے اعتبار سے بھی ایک بالکل غیر سیاسی قوم قرار دیا ہے۔ ممکن ہے بعض لوگوں کو اس رائے سے پورا پورا اتفاق نہ ہو، تاہم اس حقیقت سے تو کوئی شخص بھی انکار نہیں کر سکتا کہ اہل عرب اسلام سے پہلے اپنی پوری تاریخ میں کبھی وحدت اور مرکزیت سے آشنا نہ ہوئے، بلکہ ہمیشہ ان پر نراج اور انارکی کا تسلط رہا۔ پوری قوم جنگجو اور باہم نبرد آزما قبائل کا ایک مجموعہ تھی جس کی ساری قوت وصلاحیت خانہ جنگیوں اور آپس کی لوٹ مار میں برباد ہوتی تھی۔ اتحاد، تنظیم، شعور قومیت اور حکم واطاعت

وغیرہ جیسی چیزیں جن پر اجتماعی اور سیاسی زندگی کی بنیادیں قائم ہوتی ہیں، ان کے اندر یکسر مفقود تھیں۔ ایک خاص بدویانہ حالت پر صدیوں تک زندگی گزارتے گزارتے ان کا مزاج نزاع پسندی کے لیے اتنا پختہ ہو چکا تھا کہ ان کے اندر وحدت و مرکزیت پیدا کرنا ایک امر محال بن چکا تھا۔ خود قرآن نے ان کو 'قَوْمًا لُّدًّا'* کے لفظ سے تعبیر فرمایا ہے جس کے معنی جھگڑالو قوم کے ہیں۔ اور ان کی وحدت و تنظیم کے بارے میں فرمایا ہے کہ 'لَوْ اَنْفَقْتَ مَا فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا مَّآ اَلَّفْتَ بَیْنَ قُلُوْبِهِمْ'** (اگر تم زمین کے سارے خزانے بھی خرچ کر ڈالتے جب بھی ان کے دلوں کو آپس میں جوڑ نہیں سکتے تھے)۔

لیکن نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ۲۳ سال کی قلیل مدت میں اپنی تعلیم و تبلیغ سے اس قوم کے مختلف عناصر کو اس طرح جوڑ دیا کہ یہ پوری قوم ایک بنیان مرصوص بن گئی۔ یہ صرف متحد اور منظم ہی نہیں ہو گئی، بلکہ اس کے اندر سے صدیوں کے پرورش پائے ہوئے اسباب نزاع و اختلاف بھی ایک ایک کر کے دور ہو گئے۔ یہ صرف اپنے ظاہر ہی میں متحد و مربوط نہیں ہو گئی، بلکہ اپنے باطنی عقائد و نظریات میں بھی بالکل ہم آہنگ و ہم رنگ ہو گئی، یہ صرف خود ہی منظم نہیں ہو گئی، بلکہ اس نے پوری انسانیت کو بھی اتحاد و تنظیم کا پیغام دیا۔ اور اس کے اندر حکم و اطاعت دونوں چیزوں کی ایسی اعلیٰ صلاحیتیں ابھر آئیں کہ صرف استعارے کی زبان میں نہیں، بلکہ واقعات کی زبان میں یہ قوم شتر بانی کے مقام سے جہاں بانی کے مقام پر پہنچ گئی۔ اور اس نے بلا استثنا دنیا کی ساری ہی قوموں کو سیاست اور جہاں بانی کا درس دیا۔

اس تنظیم و تالیف کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ یہ ایک بالکل اصولی اور انسانی تنظیم تھی۔ اس کے پیدا کرنے میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے نہ تو قومی، نسلی، لسانی اور جغرافیائی تعصّبات سے کوئی فائدہ اٹھایا نہ قومی حوصلوں کی انگیخت سے کوئی کام لیا، نہ دنیوی مفادات کا کوئی لالچ دلایا، نہ کسی دشمن کے ہوّے سے لوگوں کو ڈرایا۔ دنیا میں جتنے بھی چھوٹے بڑے مدبر اور سیاست دان گزرے ہیں، انھوں نے ہمیشہ اپنے سیاسی منصوبوں کی تکمیل میں انھی محرکات سے کام لیا ہے۔ اگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم بھی ان چیزوں سے فائدہ اٹھاتے تو یہ بات آپ کی قوم کے مزاج کے بالکل مطابق ہوتی، لیکن آپ نے نہ صرف یہ کہ ان چیزوں سے کوئی فائدہ نہیں اٹھایا، بلکہ ان میں سے ہر چیز کو ایک فتنہ قرار دیا اور ہر فتنہ کی خود اپنے ہاتھوں سے بیخ کنی فرمائی۔ آپ نے اپنی قوم کو صرف خدا کی بندگی اور اطاعت، عالم گیر انسانی اخوت، ہمہ گیر عدل و انصاف، اعلاے کلمۃ اللہ اور خوف آخرت کے محرکات سے جگایا۔ یہ سارے محرکات نہایت اعلیٰ اور پاکیزہ تھے، اس وجہ سے آپ کی مساعی سے دنیا کی قوموں میں صرف ایک قوم کا اضافہ نہیں ہوا، بلکہ ایک بہترین امت ظہور میں

* مریم ۱۹: ۹۷۔

** الانفال ۸: ۶۳۔

آئی جس کی تعریف یہ بیان کی گئی ہے: 'کُنتُم خَیرَ اُمَّۃٍ اُخرِجَت لِلنَّاسِ تَاْمُرُونَ بِالمَعرُوفِ وَتَنھَونَ عَنِ المُنکَرِ*' (تم دنیا کی بہترین امت ہو جو لوگوں کو نیکی کا حکم دینے اور برائی سے روکنے کے لیے اٹھائے گئے ہو)۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سیاست اور حضور کے تدبر کا ایک اہم پہلو یہ بھی ہے کہ آپ جن اصولوں کے داعی بن کر اٹھے اگرچہ وہ، جیسا کہ میں نے عرض کیا، فرد، معاشرہ اور قوم کی ساری زندگی پر حاوی تھے، انفرادی واجتماعی زندگی کا ہر گوشہ ان کے احاطہ میں آتا تھا، لیکن آپ نے اپنے کسی اصول کے معاملہ میں کبھی کوئی لچک قبول نہیں فرمائی۔ نہ دشمن کے مقابل میں نہ دوست کے مقابل میں۔ آپ کو سخت سے سخت حالات سے سابقہ پیش آیا۔ ایسے سخت حالات سے کہ لوہا بھی ہوتا تو ان کے مقابل میں نرم پڑ جاتا۔ لیکن آپ کی پوری زندگی گواہ ہے کہ آپ نے کسی سختی سے دب کر، کسی اصول کے معاملہ میں کوئی سمجھوتا گوارا نہیں فرمایا۔ اسی طرح آپ کے سامنے پیش کشیں بھی کی گئیں اور آپ کو مختلف قسم کی دینی اور دنیوی مصلحتیں بھی سمجھانے کی کوشش کی گئی، لیکن ان چیزوں میں سے بھی کوئی چیز آپ کو متاثر یا مرعوب نہ کر سکی۔ چنانچہ آپ جب دنیا سے تشریف لے گئے تو اس حال میں تشریف لے گئے کہ آپ کی زبان مبارک سے نکلی ہوئی ہر بات اپنی جگہ پر پتھر کی لکیر کی طرح ثابت و قائم تھی۔ دنیا کے مدبروں اور سیاست دانوں میں سے کسی ایسے مدبر اور سیاست دان کا نشان آپ نہیں دے سکتے جو اپنے دو چار اصولوں کو بھی دنیا میں برپا کرنے میں اتنا مضبوط ثابت ہو سکا ہو کہ اس کی نسبت یہ دعویٰ کیا جا سکے کہ اس نے اپنے کسی اصول کے معاملہ میں کمزوری نہیں دکھائی یا کوئی ٹھوکر نہیں کھائی۔ لیکن حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک پورا نظام زندگی کھڑا کر دیا جو اپنی خصوصیات کے لحاظ سے زمانہ کے مذاق اور رجحان سے اتنا بے جوڑ تھا کہ وقت کے مدبرین اور ماہرین سیاست اس انوکھے نظام کے پیش کرنے کے سبب سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو نعوذ باللہ دیوانہ کہتے تھے، لیکن حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس نظام زندگی کو عملاً دنیا میں برپا کر کے ثابت کر دیا کہ جو لوگ آپ کو دیوانہ سمجھتے تھے، وہ خود دیوانے تھے۔

صرف یہی نہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی ذاتی مفاد یا مصلحت کی خاطر اپنے کسی اصول میں کوئی ترمیم نہیں فرمائی، بلکہ اپنے پیش کردہ اصولوں کے لیے بھی اپنے اصولوں کی قربانی نہیں دی۔ اصولوں کے لیے جان اور مال اور دوسری تمام محبوبات کی قربانی دی گئی، ہر طرح کے خطرات برداشت کیے گئے اور ہر طرح کے نقصانات گوارا کیے گئے، لیکن اصولوں کی ہر حال میں حفاظت کی گئی۔ اگر کوئی بات صرف کسی خاص مدت تک کے لیے تھی تو اس کا معاملہ اور تھا، وہ اپنی مدت پوری کر چکنے کے بعد ختم ہو گئی یا اس کی جگہ اس سے بہتر کسی دوسری چیز نے لے لی، لیکن باقی رہنے والی

* آل عمران ۳: ۱۱۰۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

چیزیں ہر حال میں اور ہر قیمت پر باقی رکھی گئیں۔ آپ کو اپنی پوری زندگی میں یہ کہنے کی نوبت کبھی نہیں آئی کہ میں نے دعوت تو دی تھی فلاں اصول کی، لیکن اب حکمت عملی کا تقاضا یہ ہے کہ اس کو چھوڑ کر اس کی جگہ پر فلاں بات بالکل اس کے خلاف اختیار کر لی جائے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سیاست اس اعتبار سے بھی دنیا کے لیے ایک نمونہ اور مثال ہے کہ آپ نے سیاست کو عبادت کی طرح ہر قسم کی آلودگیوں سے پاک رکھا۔ آپ جانتے ہیں کہ سیاست میں وہ بہت سی چیزیں مباح، بلکہ بعض صورتوں میں مستحسن سمجھی جاتی ہیں جو شخصی زندگی کے کردار میں مکروہ اور حرام قرار دی جاتی ہیں۔ اگر کوئی شخص اپنی کسی ذاتی غرض کے لیے جھوٹ بولے، چال بازیاں کرے، عہد شکنیاں کرے، لوگوں کو فریب دے یا ان کے حقوق غصب کرے تو اگرچہ اس زمانے میں اقدار اور پیمانے بہت کچھ بدل چکے ہیں۔ تاہم اخلاق بھی ان چیزوں کو معیوب ٹھیراتا ہے، اور قانون بھی ان باتوں کو جرم قرار دیتا ہے۔ لیکن اگر ایک سیاست دان اور ایک مدبر یہی سارے کام اپنی زندگی میں اپنی قوم یا اپنے ملک کے لیے کرے تو یہی سارے کام اس کے فضائل و کمالات میں شمار ہوتے ہیں۔ اس کی زندگی میں بھی اس کے اس طرح کے کارناموں پر اس کی تعریفیں ہوتی ہیں اور مرنے کے بعد بھی اپنے انھی کمالات کی بنا پر وہ اپنی قوم کا ہیرو سمجھا جاتا ہے۔ سیاست کے لیے یہی اوصاف و کمالات عرب جاہلیت میں بھی ضروری سمجھے جاتے تھے اور اس کا نتیجہ یہ تھا کہ جو لوگ ان باتوں میں شاطر ہوتے، وہی لوگ ابھر کر قیادت کے مقام پر آتے تھے۔

لیکن حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی سیاسی زندگی سے دنیا کو یہ درس دیا کہ ایمان داری اور سچائی جس طرح انفرادی زندگی کی بنیادی اخلاقیات میں سے ہے، اسی طرح اجتماعی اور سیاسی زندگی کے لوازم میں سے بھی ہے، بلکہ آپ نے ایک عام شخص کے جھوٹ کے مقابل میں ایک صاحب اقتدار اور ایک بادشاہ کے جھوٹ کو، جیسا کہ حدیث میں وارد ہے، کہیں زیادہ سنگین قرار دیا ہے۔ آپ کی پوری سیاسی زندگی ہمارے سامنے ہے۔ اس سیاسی زندگی میں وہ تمام مراحل آپ کو پیش آئے جن کے پیش آنے کی ایک سیاسی زندگی میں توقع کی جا سکتی ہے۔ آپ نے ایک طویل عرصہ نہایت مظلومیت کی حالت میں گزارا، اور کم و بیش اتنا ہی عرصہ آپ نے اقتدار اور سلطنت کا گزارا۔ اس دوران میں آپ کو حریفوں اور حلیفوں، دونوں سے مختلف قسم کے سیاسی اور تجارتی معاہدے کرنے پڑے، دشمنوں سے متعدد جنگیں کرنی پڑیں۔ عہد شکنی کرنے والوں کے خلاف جوابی اقدامات کرنے پڑے۔ قبائل کے وفود سے معاملے کرنے پڑے۔ آس پاس کی حکومتوں کے وفود سے سیاسی گفتگوئیں کرنی پڑیں، اور سیاسی گفتگوؤں کے لیے اپنے وفود ان کے پاس بھیجنے پڑے۔ بعض بیرونی طاقتوں کے خلاف فوجی اقدامات کرنے پڑے۔ یہ سارے کام آپ نے انجام دیے،

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

لیکن دوست اور دشمن ہر شخص کو اس بات کا اعتراف ہے کہ آپ نے کبھی کوئی جھوٹا وعدہ نہیں کیا۔ اپنی کسی بات کی غلط تاویل کرنے کی کوشش نہیں فرمائی۔ کوئی بات کہہ چکنے کے بعد اس سے انکار نہیں کیا۔ کسی معاہدہ کی کبھی خلاف ورزی نہیں کی۔ حلیفوں کا نازک سے نازک حالات میں بھی ساتھ دیا، اور دشمنوں کے ساتھ بدتر سے بدتر حالات میں بھی انصاف کیا۔ اگر آپ دنیا کے مدبرین اور اہل سیاست کو اس کسوٹی پر جانچیں تو میں پورے اعتماد کے ساتھ یہ کہتا ہوں کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا کسی کو بھی آپ اس کسوٹی پر کھرا نہ پائیں گے۔ پھر یہ بات بھی ملحوظ رکھنے کی ہے کہ سیاست میں عبادت کی سی دیانت اور سچائی قائم رکھنے کے باوجود حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی سیاست میں کبھی کسی ناکامی کا تجربہ نہیں کرنا پڑا۔ اب آپ اس چیز کو چاہے تدبر سے تعبیر کیجیے یا حکمت نبوت سے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سیاست اور حضور کے تدبر کا یہ بھی اعجاز ہے کہ آپ نے عرب جیسے ملک کے ایک ایک گوشہ میں امن وعدل کی حکومت قائم کر دی۔ کفار ومشرکین کا زور آپ نے اس طرح توڑ دیا کہ فتح مکہ کے موقع پر فی الواقع انھوں نے گھٹنے ٹیک دیے۔ یہود کی سیاسی سازشوں کا بھی آپ نے خاتمہ کر دیا۔ رومیوں کی سرکوبی کے لیے بھی آپ نے انتظامات فرمائے۔ یہ سارے کام آپ نے کر ڈالے، لیکن اس سارے جہاد کے اندر انسانی خون بہت کم بہا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے کی تاریخ بھی شہادت دیتی ہے اور آج کے واقعات بھی شہادت دے رہے ہیں کہ دنیا کے چھوٹے چھوٹے انقلابات میں بھی ہزاروں لاکھوں جانیں ختم ہو جاتی ہیں اور مال واسباب کی بربادی کا تو کوئی اندازہ ہی نہیں کیا جا سکتا، لیکن نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے مبارک ہاتھوں سے جو انقلاب برپا ہوا، اس کی عظمت اور وسعت کے باوجود شاید ان نفوس کی تعداد سو سے زیادہ نہیں ہو گی جو اس ساری جدوجہد کے دوران میں حضور کے ساتھیوں میں سے شہید ہوئے یا مخالف گروہ کے آدمیوں میں سے قتل ہوئے۔

پھر یہ بات بھی غایت درجہ اہمیت رکھتی ہے کہ دنیا کے معمولی معمولی انقلابات میں بھی ہزاروں لاکھوں آبروئیں فاتح فوجوں کی ہوس کا شکار ہو جاتی ہیں۔ اس تہذیب وتمدن کے زمانہ میں بھی ہم نے دیکھا ہے کہ فاتح ملک کی فوجوں نے مفتوح ملک کی سڑکیں اور گلیاں حرام کی نسلوں سے بھر دی ہیں۔ اور ستم بالائے ستم یہ ہے کہ ارباب سیاست اس صورت حال پر شرمندگی اور ندامت کا اظہار کرنے کے بجائے اس کو ہر انقلاب کا ایک ناگزیر نتیجہ قرار دیتے ہیں، لیکن حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی قیادت میں دنیا میں جو انقلاب رونما ہوا، اس کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ کوئی ایک واقعہ بھی ہم کو ایسا نہیں ملتا کہ کسی کے ناموس پر دست درازی ہوئی ہو۔

اہل سیاست کے لیے طمطراق بھی سیاست کے لوازم میں سے سمجھا جاتا ہے۔ جو لوگ عوام کو ایک نظام میں پرونے

اور ایک نظم قاہر کے تحت منظّم کرنے کے لیے اٹھتے ہیں، وہ بہت سی باتیں اپنوں اور بیگانوں پر اپنی سطوت جمانے اور اپنی ہیبت قائم کرنے کے لیے اختیار کرتے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ یہ ساری باتیں ان کی سیاسی زندگی کے لازمی تقاضوں میں سے ہیں۔ اگر وہ یہ باتیں نہ اختیار کریں گے تو سیاست کے جو تقاضے ہیں، وہ ان کے پورے کرنے سے قاصر رہ جائیں گے۔ اسی طرح کے مقاصد کے پیش نظر جب وہ نکلتے ہیں تو بہت سے لوگ ان کے جلو میں چلتے ہیں۔ جہاں وہ ظاہر ہوتے ہیں، ان کے نعرے بلند کرائے جاتے ہیں۔ جہاں وہ اترتے ہیں، ان کے جلوس نکالے جاتے ہیں۔ جلسوں میں ان کے حضور میں ایڈریس پیش کیے جاتے ہیں اور ان کی شان میں قصیدے پڑھے جاتے ہیں۔ جب وہ مزید ترقی کر جاتے ہیں تو ان کے لیے قصر وایوان آراستہ کیے جاتے ہیں، ان کو سلامیاں دی جاتی ہیں، ان کے لیے برّی و بحری اور ہوائی خاص سواریوں کے انتظامات کیے جاتے ہیں۔ جب کبھی وہ سڑک پر نکلنے والے ہوتے ہیں تو وہ سڑک دوسروں کے لیے بند کر دی جاتی ہے۔ اس زمانہ میں ان چیزوں کے بغیر کسی صاحب سیاست کا تصور نہ دوسرے لوگ ہی کرتے ہیں اور نہ کوئی صاحب سیاست ان لوازم سے الگ خود اپنا کوئی تصور کرتا ہے، لیکن ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اس اعتبار سے بھی دنیا کے تمام اہل سیاست سے الگ رہے۔ جب آپ اپنے صحابہ رضی اللہ عنہم میں چلتے تو کوشش فرماتے کہ سب کے پیچھے چلیں۔ مجلس میں تشریف رکھتے تو اس طرح گھل مل کر بیٹھتے کہ یہ امتیاز کرنا مشکل ہوتا کہ حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کون ہیں۔ کھانا کھانے کے لیے بیٹھتے تو دوزانو ہو کر بیٹھتے اور فرماتے کہ میں اپنے رب کا غلام ہوں اور جس طرح ایک غلام کھانا کھاتا ہے، اسی طرح میں بھی کھانا کھاتا ہوں۔ ایک مرتبہ ایک بدو اپنے اس تصور کی بنا پر جو حضور کے بارے میں اس کے ذہن میں رہا ہوگا سامنے آیا تو حضور کو دیکھ کر کانپ گیا۔ آپ نے اسے تسلی دیتے ہوئے فرمایا کہ ڈرو نہیں میری ماں بھی سوکھا گوشت کھایا کرتی تھی، یعنی جس طرح تم نے اپنی ماں کو بدویانہ زندگی میں سوکھا گوشت کھاتے دیکھا ہوگا، اسی طرح کا سوکھا گوشت کھانے والی ایک ماں کا بیٹا میں بھی ہوں۔ نہ آپ کے لیے کوئی خاص سواری تھی، نہ کوئی خاص قصر وایوان تھا، نہ کوئی خاص باڈی گارڈ تھا۔ آپ جو لباس دن میں پہنتے، اسی میں شب میں استراحت فرماتے اور تمام اہم سیاسی امور کے فیصلے فرماتے۔

یہ خیال نہ فرمایئے کہ اس زمانہ کی بدویانہ زندگی میں سیاست اس طمطراق اور اس ٹھاٹ باٹ سے آشنا نہیں ہوئی تھی، جس طمطراق اور جس ٹھاٹ باٹ کی وہ اب عادی ہو گئی ہے۔ جو لوگ یہ خیال کرتے ہیں، ان کا خیال بالکل غلط ہے۔ سیاست اور اہل سیاست کی تانا شاہی ہمیشہ سے یہی رہی ہے۔ فرق اگر ہوا ہے تو محض بعض ظاہری باتوں میں ہوا ہے۔ البتہ ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک نئے طرز کی سیاسی زندگی کا نمونہ دنیا کے سامنے رکھا جس میں

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

دنیوی کرّوفر کے بجاے خلافت الٰہی کا جلال اور ظاہری ٹھاٹ باٹ کی جگہ خدمت اور محبت کا جمال تھا۔لیکن اس سادگی اور فقر و درویشی کے باوجود اس کے دبدبے اور اس کے شکوہ کا یہ عالم تھا کہ روم و شام کے بادشاہوں پر اس کے تصور سے لرزہ طاری ہوتا تھا۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیاست اور آپ کے تدبر کا ایک اور پہلو بھی خاص طور پر قابل ذکر ہے کہ آپ نے اپنی حیات مبارکہ میں ہی ایسے لوگوں کی ایک بہت بڑی جماعت بھی تربیت کر کے تیار کر دی جو آپ کے پیدا کردہ انقلاب کو اس کے اصلی مزاج کے مطابق آگے بڑھانے، اس کو مستحکم کرنے اور اجتماعی و سیاسی زندگی میں اس کے تمام مقتضیات کو بروے کار لانے کے لیے پوری طرح اہل تھے۔ چنانچہ اس تاریخی حقیقت سے کوئی شخص بھی انکار نہیں کر سکتا کہ حضور کی وفات کے بعد اس انقلاب نے عرب سے نکل کر آس پاس کے دوسرے ممالک میں قدم رکھ دیا۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے اس کرۂ ارض کے تین براعظموں میں اس نے اپنی جڑیں جمالیں۔ اور اس کی اس وسعت کے باوجود اس کی قیادت کے لیے موزوں اشخاص و رجال کی کمی محسوس نہیں ہوئی۔ میں نے جن تین براعظموں کی طرف اشارہ کیا ہے، ان کے متعلق یہ حقیقت بھی ہر شخص جانتا ہے کہ ان کے اندر وحشی قبائل آباد نہیں تھے، بلکہ وقت کی نہایت ترقی یافتہ جبار و قہار شاہنشاہتیں تھیں۔ لیکن اسلامی انقلاب کی موجوں نے جزیرۂ عرب سے اٹھ کر ان کو ان کی جڑوں سے اس طرح اکھاڑ کر پھینکا، گویا زمین میں ان کی کوئی بنیاد ہی نہیں تھی۔ اور ان کے ظلم و جور کی جگہ ہر گوشے میں اسلامی تہذیب و تمدن کی برکتیں پھیلا دیں جن سے دنیا صدیوں تک متمتع ہوتی رہی۔

دنیا کے تمام مدبرین اور اہل سیاست کی پوری فہرست پر نگاہ ڈال کر غور کیجیے کہ ان میں کوئی ایک شخص بھی ایسا نظر آتا ہے جس نے اپنے دو چار ساتھی بھی ایسے بنانے میں کامیابی حاصل کی ہو، جو اس کے فکر و فلسفہ اور اس کی سیاست کے ان معنوں میں عالم اور عامل رہے ہوں، جن معنوں میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بتائے ہوئے طریقہ کے عالم و عامل ہزاروں صحابہ رضی اللہ عنہم تھے۔

آخر میں ایک بات بطور تنبیہ عرض کر دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا اصلی مرتبہ اور مقام یہ ہے کہ آپ نبی خاتم اور پیغمبر عالم ہیں۔ سیاست اور تدبر اس مرتبۂ بلند کا ایک ادنیٰ شعبہ ہے۔ جس طرح ایک حکمران کی زندگی پر ایک تحصیل دار کی زندگی کے زاویہ سے غور کرنا ایک بالکل ناموزوں بات ہے، اس سے زیادہ ناموزوں بات شاید یہ ہے کہ ہم سید کونین صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی پر ایک ماہر سیاست یا ایک مدبر کی زندگی کی حیثیت سے غور کریں۔ نبوت اور رسالت ایک عظیم عطیۂ الٰہی ہے۔ جب یہ عطیہ اللہ تعالیٰ اپنے کسی بندے کو بخشتا ہے تو وہ سب کچھ

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

اس کو بخش دیتا ہے، جو اس دنیا میں بخشا جا سکتا ہے۔ پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم تو صرف نبی ہی نہیں تھے، بلکہ خاتم الانبیا تھے، صرف رسول ہی نہیں تھے، بلکہ سید الرسل تھے۔ صرف اہل عرب ہی کے لیے نہیں، بلکہ تمام عالم کے لیے مبعوث ہوئے تھے اور آپ کی تعلیم و ہدایت صرف کسی خاص مدت تک ہی کے لیے نہیں تھی، بلکہ ہمیشہ باقی رہنے والی تھی اور یہ بھی ہر شخص جانتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کسی دین رہبانیت کے داعی بن کر نہیں آئے تھے، بلکہ ایک ایسے دین کے داعی تھے جو روح اور جسم، دونوں پر حاوی اور دنیا و آخرت، دونوں کی حسنات کا ضامن تھا۔ جس میں عبادت کے ساتھ سیاست اور درویشی کے ساتھ حکمرانی کا جوڑ محض اتفاق سے نہیں پیدا ہو گیا تھا، بلکہ یہ عین اس کی فطرت کا تقاضا تھا۔ جب صورت حال یہ ہے تو ظاہر ہے کہ حضور سے بڑا سیاست دان اور مدبر کون ہو سکتا ہے، لیکن یہ چیز آپ کا اصلی کمال نہیں بلکہ، جیسا کہ میں نے عرض کیا، آپ کے فضائل و کمالات کا محض ایک ادنیٰ شعبہ ہے۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

محمد وسیم اختر مفتی

حضرت ضمام بن ثعلبہ رضی اللہ عنہ

تاریخ اسلامی میں حضرت ضمام (ضمضام: ابن خلدون) بن ثعلبہ کے قبول اسلام کا قصہ بیان ہوا ہے، تاہم بعد کے حالات کی تفصیل نہیں ملتی۔ ان کا تعلق عدنانی قبیلہ بنوسعد بن بکر سے تھا، اس لیے سعدی کہلاتے تھے۔ سعد بن بکر قبیلۂ بنوہوازن کے بانی ہوازن بن منصور کے پوتے تھے، قیس بن عیلان (یا قیس عیلان) ان کے چھٹے اور نزار بن معد نویں جد تھے۔ بنوہوازن کی باقی دو شاخیں سعد کے بھائیوں ـــــ معاویہ بن بکر اور منبہ بن بکر ـــــ سے منسوب تھیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دایہ حلیمہ سعدیہ بنت ابوذؤیب بنوسعد سے تعلق رکھتی تھیں۔ یہ ایسی نسبت تھی جس کی بنا پر بنوسعد اپنے چچیروں، یعنی بقیہ بنوہوازن کے آگے بجا طور پر فخر کرتے تھے۔ ایک روایت کے مطابق سیدہ حلیمہ کے شوہر حارث بن عبدالعزیٰ کی کنیت ابوکبشہ تھی، اور ان سے نسبت رضاعت رکھنے کی وجہ سے عرب آپ کو ابن ابوکبشہ کے نام سے پکارتے تھے۔ فتح مصر کے بعد بنوسعد مصر گئے اور وہاں پر آباد بنوکہلان کی اولاد بنوجذام بن عدی کے ساتھ گھل مل گئے۔ ابن حجر کہتے ہیں کہ کچھ لوگوں کو وہم ہوا اور انھوں نے حضرت ضمام کا تعلق بنوتمیم سے جوڑ دیا جو درست نہیں۔ مضر بن نزار پر حضرت ضمام کا شجرہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے شجرۂ نسب سے جا ملتا ہے، مضر آپ کے اٹھارویں جد تھے۔ بغوی کا کہنا ہے کہ حضرت ضمام کوفہ میں رہتے تھے۔

ابن اسحاق کے بقول ۹ھ میں اور واقدی و ابن سعد کی روایت کے مطابق رجب ۵ھ میں قبیلۂ بنوسعد نے دین اسلام کی تعلیم حاصل کرنے کے لیے اپنے ایک اہم فرد ضمام بن ثعلبہ کو آپ کی طرف روانہ کیا۔ حضرت ضمام قوی جسم کے مالک تھے، ان کے سر پر گھنے بال تھے اور انھوں نے دو چوٹیاں کر رکھی تھیں۔ ان کی آمد کی تفصیل حضرت انس بن مالک

رضی اللہ عنہ یوں روایت کرتے ہیں: ہم نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مسجد نبوی میں بیٹھے تھے کہ اونٹ پر سوار ایک شخص آیا، اونٹ کو مسجد میں (مسجد کے دروازے پر، مستدرک حاکم، رقم ۴۳۸۰) بٹھا کر اسے رسی باندھی، پھر ہم سے پوچھا: تم میں سے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کون ہیں؟ نبی صلی اللہ علیہ وسلم تکیہ لگائے ہمارے درمیان تشریف فرما تھے۔ ہم نے جواب دیا: یہ سرخ وسفید صاحب جو تکیہ لگائے ہوئے ہیں، ابن عبدالمطلب؟ اس نے وضاحت چاہی۔ آپ نے فرمایا: ہاں، میں سن رہا ہوں۔ اس نے کہا: میں آپ سے کچھ سوالات کروں گا اور سوال پوچھنے میں سختی سے کام لوں گا، آپ دل میں ملال نہ رکھیے گا۔ فرمایا: پوچھو، جو جی میں آتا ہے، میں برا نہیں مناؤں گا۔ وہ بولا: میں آپ کے رب اور آپ سے پہلوں کے معبود کی قسم دے کر پوچھتا ہوں کہ کیا اللہ نے آپ کو تمام انسانوں کی طرف رسول بنا کر بھیجا ہے؟ آپ نے فرمایا: ہاں، بالکل۔ پھر سوال کیا: میں آپ کو اللہ کا واسطہ دے کر پوچھتا ہوں کہ کیا اللہ نے آپ کو حکم دیا ہے کہ ہم دن رات میں پانچ نمازیں پڑھیں؟ جواب فرمایا: ہاں، اللہ! تو گواہ ہے۔ اگلا سوال تھا: میں اللہ کا نام لے کر پوچھتا ہوں کہ کیا اللہ نے آپ کو یہ حکم دیا ہے کہ ہم سال کے اس مہینے، رمضان میں روزے رکھیں؟ ارشاد فرمایا: یقیناً۔ پھر دریافت کیا: میں اللہ کے واسطے سے پوچھتا ہوں کہ کیا اللہ ہی نے آپ کو حکم دیا ہے کہ ہم اپنے مال داروں سے زکوٰۃ لے کر اپنے غربا میں بانٹ دیں؟ ''بالکل''، نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا جواب تھا۔ وہ بولا: میں اس دین پر ایمان لایا جو آپ نے پیش کیا، میں پیچھے موجود اپنی قوم کا ایلچی، ضمام بن ثعلبہ ہوں، قبیلۂ بنوسعد کا ایک فرد (بخاری، رقم ۶۳، نسائی، رقم ۲۰۹۳)۔ مسند احمد، مستدرک حاکم اور کتب سیر میں قصۂ ضمام کی روایت کے الفاظ قدرے اختلاف کے ساتھ اس طرح ہیں: میں آپ کو اس اللہ کی قسم دے کر پوچھتا ہوں جو آپ کا اور آپ سے پہلے گزرنے والے اور آپ کے بعد آنے والے لوگوں کا معبود ہے، کیا اللہ نے آپ کو حکم دیا ہے کہ ہم اکیلے اسی کی عبادت کریں، کسی کو بھی اس کے ساتھ شریک نہ ٹھہرائیں اور اپنے پاس سے گھڑے ہوئے ان ہم سروں کا طوق گردن سے اتار پھینکیں جن کی ہمارے آبا و اجداد پوجا کرتے آئے ہیں؟ آپ نے فرمایا: اللہ گواہ ہے، بالکل۔ آپ نے اسلام کے فرائض، زکوٰۃ، روزہ، حج ایک ایک کر کے بتائے۔ ہر فرض کے ذکر پر ضمام آپ کو قسم دے کر اس کی تصدیق کرتے، جس طرح پہلے کر چکے تھے۔ آپ اپنا بیان مکمل کر چکے تو ضمام پکارے: میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں، دراں حالیکہ وہ اکیلا ہے اور کوئی اس کا شریک نہیں۔ اور میں گواہی دیتا ہوں کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اللہ کے رسول ہیں۔ میں یہ فرائض ادا کروں گا، ان ممنوعات سے اجتناب کروں گا جن سے آپ نے منع فرمایا ہے اور اپنی طرف سے کوئی کمی و بیشی نہ کروں گا۔ حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ ہمیں قرآن مجید میں اللہ کی طرف سے حکم ہوا تھا کہ

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ سوالات نہ کریں، اس لیے بڑا تعجب ہوا کہ ایک بدو آپ سے سوال پہ سوال کیے جا رہا ہے اور ہم سن رہے ہیں۔ اس بدو نے (ہر سوال کے شروع میں کہا کہ) آپ کے بھیجے ہوئے معلم نے یوں بتایا ہے (پھر ارکان اسلام میں سے ہر ایک کی آپ کی زبان مبارک سے تصدیق کرائی) (نسائی، رقم ۲۰۹۳)۔ (آپ سے مذاکرہ کرنے کے بعد) حضرت ضمام واپس جانے کے لیے اونٹ کی طرف بڑھے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: یہ دو چوٹیوں والا اپنے قول میں سچا ثابت ہوا تو جنت میں جائے گا۔ انھوں نے اونٹ کی رسی کھولی اور روانہ ہو گئے۔ اپنی قوم میں پہنچے تو لوگ ان کے پاس اکٹھے ہو گئے۔ پہلی بات جوان کے منہ سے نکلی، یہ تھی کہ کیا ہی برے ہیں لات اور عزیٰ۔ قوم کا جواب تھا: رکیے، ضمام، پھل بہری سے ڈریے، کوڑھ پن سے ڈریے، پاگل پن لاحق ہونے سے ڈرو۔ حضرت ضمام بولے: بربادی ہو! یہ لات و عزیٰ نقصان پہنچاتے ہیں نہ نفع۔ اللہ نے ایک رسول مبعوث کیا ہے اور اس پر ایک کتاب نازل کی ہے۔ ان گمراہیوں سے تمھیں نکال دیا ہے جن میں تم مبتلا تھے۔ میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ اکیلے کے سوا کوئی معبود نہیں، اس کا کوئی شریک نہیں اور محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اللہ کے بندے اور اس کے رسول ہیں۔ میں آپ کے پاس سے وہ احکام لایا ہوں جو آپ نے کرنے کو کہے ہیں اور وہ ممنوعات جنھیں کرنے سے روکا ہے۔ اس دن حضرت ضمام کے قبیلے کی کوئی عورت، کوئی مرد ایسا نہ رہا جس نے اسلام قبول نہ کیا ہو۔ حضرت عبداللہ بن عباس کہتے ہیں کہ آں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جتنے وفود آئے، ہم نے نہیں سنا کہ حضرت ضمام کی قوم سے بہتر کوئی قوم ہو (احمد، رقم ۲۳۸۰، مستدرک حاکم، رقم ۴۳۸۰)۔ انھوں نے مسجدیں تعمیر کیں اور اذان دینے کا سلسلہ شروع کر دیا۔

سیاق کلام سے پتا چلتا ہے کہ یہ اس وقت کا واقعہ ہے جب عزیٰ کا بت پاش پاش نہ ہوا تھا۔ حضرت ضمام فتح مکہ سے پہلے پہلے اپنی قوم میں واپس پہنچ گئے ہوں گے، کیونکہ فتح کے بعد ہی حضرت خالد بن ولید نے مشرکوں کے اس معبود کو ریزہ ریزہ کیا تھا (ابن کثیر)۔ روایت میں حج کا ذکر کسی راوی نے شامل کر دیا ہے، کیونکہ حج اس وقت تک فرض نہ ہوا تھا (ابن قیم)۔ حضرت عمر فرمایا کرتے تھے: میں نے نہیں دیکھا کہ کسی نے حضرت ضمام سے زیادہ بلیغانہ اختصار کے ساتھ، ان سے بہتر طریقے پر آپ سے سوال پوچھا ہو۔ امام بخاری کہتے ہیں کہ حدیث ضمام سے علما نے اس بات پر استشہاد کیا ہے کہ شیخ کو سبق سنا کر سیکھا جا سکتا ہے، یعنی یہ حصول علم کا ایک ذریعہ ہے۔ حضرت ضمام نے اپنی قوم کو یہی تعلیم دی تو سب نے اسے مان لیا (بخاری، کتاب العلم: ۶)۔

حضرت طلحہ بن عبید اللہ رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ نجد کا ایک شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں

www.al-mawrid.org www.javedahmadghamidi.com

حاضر ہوا۔اس کے سر کے بال بکھرے ہوئے تھے،ہمیں اس کی آواز کی بھنبھناہٹ سنائی دیتی تھی،لیکن کہی بات سمجھ میں نہ آتی تھی۔وہ آپ کے قریب ہوا تو معلوم ہوا کہ اسلام کے بارے میں استفسارات کر رہا ہے۔(ارکان اسلام بتاتے ہوئے) آپ نے فرمایا: دن اور رات میں پانچ نمازیں،تو اس نے پوچھا: کیا اور کوئی نماز بھی مجھے پڑھنی ہو گی؟ فرمایا:نہیں،نوافل البتہ پڑھ سکتے ہو۔ پھر فرمایا: رمضان کے روزے۔ پوچھا: ان کے علاوہ؟ جواب ارشاد ہوا: نفلی روزہ رکھ سکتے ہو، پھر آپ نے زکوٰۃ کا ذکر کیا تو اس نے وہی سوال دہرایا: مالی واجبات میں سے کچھ اور؟ فرمایا: نفلی صدقہ کے سوا کچھ نہیں۔وہ شخص یہ کہتے ہوئے واپس مڑ گیا: واللہ، میں ان فرائض میں کوئی کمی وبیشی نہ کروں گا۔آپ نے فرمایا:اس نے اپنی بات سچ کر دکھائی تو فلاح پا جائے گا(بخاری،رقم ۴۶،مسلم،رقم ۱۱)۔'کتاب العلم:۶' میں امام بخاری کی نقل کردہ تعلیق سے قاضی عیاض نے استدلال کیا ہے کہ اس حدیث کے سائل حضرت ضمام بن ثعلبہ ہی تھے۔ ابن عربی اور شارح بخاری ابن بطال کا بھی یہی خیال ہے۔قرطبی کہتے ہیں کہ یہ دو الگ الگ اشخاص تھے،انھیں ایک فرد قرار دینا خواہ مخواہ کی زبردستی ہے۔ابن حجر نے بھی اس کی تائید کی۔ابن اسحاق اور ابن سعد نے حضرت ضمام بن ثعلبہ کے حالات بیان کرتے ہوئے حضرت طلحہ کی اس روایت کا ذکر نہیں کیا۔

مطالعۂ مزید: السیرۃ النبویۃ (ابن ہشام)،الطبقات الکبریٰ (ابن سعد)،تاریخ الامم والملوک (طبری)،دلائل النبوۃ (بیہقی)، الاستیعاب فی معرفۃ الاصحاب (ابن عبدالبر)،المنتظم فی تواریخ الملوک والامم (ابن جوزی)،اسد الغابۃ فی معرفۃ الصحابۃ (ابن اثیر)،الکامل فی التاریخ (ابن اثیر)،البدایۃ والنہایۃ (ابن کثیر)،نہایۃ الارب فی فنون الادب (شہاب الدین نویری)،تاریخ الاسلام (ذہبی)،زاد المعاد (ابن قیم)،کتاب العبر و دیوان المبتداء والخبر (ابن خلدون)، الاصابۃ فی تمییز الصحابۃ (ابن حجر) اور شرح المواہب اللدنیہ (زرقانی)۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

امین احسن اصلاحی

نقد حدیث

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

سوال: کیا حدیث میں مزید ریسرچ کی ضرورت ہے یا جتنی احادیث ہم تک پہنچی ہیں، سب درست ہیں؟ آج کل کے دور میں ہم عقیدہ کو لے کر کوئی انقلاب برپا نہیں کر سکتے اور نہ ہی کوئی اصولی آئیڈیالوجی پیش کر سکتے ہیں جو دوسرے نظام ہاے زندگی کو شکست دے سکے۔ احادیث بہت سی ایسی ملتی ہیں جو ایک دوسرے سے ٹکراتی ہیں، قرآن سے ٹکراتی ہیں اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی شخصیت سے ٹکراتی ہیں۔ اس سلسلہ میں میں نے بعض بزرگوں سے سوالات کیے۔ وہ میرے سوالات کا تشفی بخش جواب تو نہ دے سکے، البتہ یہ کہا کہ حدیث میں شک کرنا کفر کے مترادف ہے۔ ہمارے ان بزرگوں میں یہ انتہا پسندی مغرب زدہ طبقہ کو حدیث، بلکہ مذہب سے بہت دور لے جا رہی ہے۔ ڈر ہے کہ یہ انتہا پسندی اس طبقہ کو قطعی طور پر مذہب سے انکار پر مجبور نہ کر دے، اس لیے حدیث کو سائنٹیفک طریق پر پیش کرنے کی جتنی ضرورت آج ہے، شاید پہلے کبھی نہ تھی، کیونکہ مغرب زدہ طبقہ کو صرف عقیدہ پیش کر کے خاموش نہیں کر سکتے۔ ایسی احادیث بہت تھوڑی تعداد میں ہیں جن سے شکوک وشبہات پیدا ہوتے ہیں۔ میں چند مثالیں دینے کی کوشش کروں گا:

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم روزہ رکھ کر اپنی ازواج کے بوسے لیتے اور ان سے مباشرت فرمایا کرتے تھے (بخاری)۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم روزہ رکھ کر مجھے چومتے اور میری زبان چوستے (ابوداؤد)، حالاں کہ قرآن نے روزہ کی حالت میں ان حرکات سے سخت منع کیا ہے۔ پھر کیا زبان چوسنے سے روزہ نہیں ٹوٹ جاتا؟

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ حیض کی حالت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مجھے تہ پوش پہننے کا حکم دیتے اور اس کے بعد مجھ سے مباشرت کرتے (بخاری)۔ اس معاملہ میں قرآن مجید یہ کہتا ہے کہ ''لوگ آپ سے حیض کے متعلق پوچھتے ہیں تو کہہ دیجیے کہ حیض ایک قسم کی غلاظت ہے، اس لیے دوران حیض میں بیویوں سے دور رہیے۔'' اب فرمائیے حدیث پر عمل کیا جائے یا قرآن پر؟

احادیث کے مزید تضاد ذیل کی مثالوں سے سامنے آتے ہیں:

ا۔ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ عورت، گدھا اور کتا سامنے آ جائیں تو نماز ٹوٹ جاتی ہے (مسلم)، لیکن دوسری طرف حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا ارشاد ہے کہ ''میں نماز میں حضور کے سامنے پاؤں پھیلا کر لیٹ جاتی تھی۔ جب وہ سجدہ کرتے تو مجھے آنکھ سے اشارہ کرتے، چنانچہ میں پاؤں سمیٹ لیتی اور جب وہ اٹھتے تو پھر پھیلا لیتی اور گھر میں چراغ موجود نہ تھا (بخاری)۔

پہلی حدیث میں عورت کے سامنے آ جانے سے نماز کا ٹوٹنا بتایا گیا ہے اور دوسری میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سامنے لیٹ کر کبھی پاؤں پھیلا دیتی ہیں اور کبھی سمیٹ لیتی ہیں، لیکن حضور منع نہیں فرماتے۔

۲۔ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جنت تمھاری ماں کے پاؤں تلے ہے، لیکن دوسری طرف یہ بھی فرمایا کہ میں نے جہنم کو دیکھا تو اس میں اکثر آبادی عورتوں کی نظر آئی۔ عورت کو اتنا اونچا درجہ دینے کے بعد فوراً ہی گرا دیا۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

پھر احادیث میں ایسی باتیں بھی ملتی ہیں جنھیں عقل انسانی قبول نہیں کر سکتی۔ مثلاً:

ا۔ ابن عمر رضی اللہ عنہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ سورج نکلتے اور ڈوبتے وقت نماز نہ پڑھا کرو، اس لیے کہ سورج بوقت طلوع شیطان کے دو سینگوں کے درمیان پھنسا ہوا ہوتا ہے (بخاری)۔ کیا کوئی یورپین اس حدیث کو پڑھنے کے بعد قبول اسلام پر آمادہ ہو سکتا ہے؟

ب۔ ابوذر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ غروب آفتاب کے بعد رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے پوچھا: کیا تم جانتے ہو کہ غروب کے بعد آفتاب کہاں چلا جاتا ہے؟ میں نے عرض کیا: اللہ اور اس کا رسول بہتر جانتے ہیں، آپ نے فرمایا کہ سورج بعد از غروب خدائی تخت کے نیچے سجدہ میں گر جاتا ہے۔ رات بھر اسی حالت میں پڑا دوبارہ طلوع ہونے کی اجازت مانگتا رہتا ہے، چنانچہ اسے مشرق سے نکلنے کی دوبارہ اجازت مل جاتی ہے، لیکن ایک وقت ایسا بھی آئے گا کہ اسے اجازت نہیں ملے گی اور حکم ہو گا لوٹ

جاؤ جس طرف سے آئے ہو، چنانچہ وہ مغرب کی طرف سے نکلنا شروع کر دے گا (بخاری)۔

ج۔ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ اللہ نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو رسول بنا کر بھیجا اور اس پر ایک کتاب نازل کی جس میں آیت رجم موجود تھی (بخاری)۔

ایسی احادیث کو پیش نظر رکھ کر کیا علما حضرات حق بہ جانب ہیں کہ کوئی ذرا سا بھی شک کا اظہار کرے یا یہ کہے کہ تحقیق ضروری ہے تو کفر کا فتویٰ صادر کر دیں۔

نیز اس چیز کی بھی تشریح کیجیے کہ اگر حدیث میں تحقیق کی جائے تو کس معیار کو سامنے رکھا جائے گا؟ صحیح یا غلط حدیث کو آپ کس کسوٹی پر پرکھیں گے؟ کیا صرف راوی کی سند پر ہی اکتفا کیا جائے گا یا اور کوئی کسوٹی بھی پیش نظر ہوگی؟

جواب: آپ نے حدیث کو سائنٹیفک طور پر پیش کرنے کی جس ضرورت کا اظہار فرمایا ہے، اس کی اہمیت سے کوئی عقل مند مسلمان انکار نہیں کر سکتا۔ یہ کام کرنے کا ہے اور اس میں ذرا شبہ نہیں ہے کہ صحیح اسلامی انقلاب پیدا کرنے کے لیے اس کام کا ہونا بہت ضروری ہے۔ ہم اس کی اہمیت کو اچھی طرح محسوس کرتے ہیں اور اپنے وسائل کے محدود ہونے کے باوجود اس کے کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ اگرچہ یہ نہیں کہہ سکتے کہ موجودہ مشکلات وموانع کے اندر یہ کام کب تک ہو سکے گا۔

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

مجھے اس امر واقع کا پوری طرح احساس ہے کہ بعض لوگ حدیث کے معاملہ میں ضرورت سے زیادہ حساس واقع ہوئے ہیں۔ وہ اس پر کسی تنقید کو برداشت کرنے پر تیار نہیں ہوتے۔ ہر حدیث جو حدیث کی کسی کتاب میں داخل ہو گئی ہے، ان کے نزدیک ہم پایۂ وحی بن گئی ہے، لیکن آپ یقین رکھیں کہ یہ حال صرف ان لوگوں کا ہے جو حدیث کے لیے اپنے اندر تعصب تو رکھتے ہیں، لیکن حدیث کا علم نہیں رکھتے۔ حدیث کا علم رکھنے والے علما ہمیشہ جرح وتنقید کے عادی رہے ہیں، بلکہ یہ کہنا ذرا مبالغہ نہیں ہے کہ حدیثوں کو جانچنے پرکھنے کے لیے جو اہتمام انھوں نے کیا ہے، وہ اہتمام کسی اور چیز کے لیے کسی گروہ نے بھی نہیں کیا۔ تاہم احادیث کی مزید جانچ پرکھ کی ضرورت ہوتی ہے، اس ضرورت سے ہرگز انکار نہیں کیا جا سکتا۔

لیکن جہاں مجھے اس ضرورت کا اعتراف ہے، وہاں میں اس امر کا اظہار بھی ضروری سمجھتا ہوں کہ آج جو لوگ حدیثوں پر مخالفانہ تنقید کرتے ہیں، ان میں بلا استثنا ایک شخص بھی ایسا نہیں ہے جس نے اس فن کا باقاعدہ مطالعہ کیا ہو یا جس کے اندر اس کے سمجھنے کی معمولی صلاحیت بھی موجود ہو۔ کچھ غیر ذمہ دار قسم کے لوگ جن کو نہ حدیث کی خبر ہے نہ

قرآن کی محض سنی سنائی باتوں کو لے کر آج حدیث پر تنقید کرنے بیٹھے ہیں اور گمراہ کر رہے ہیں، ان بے چاروں کو جو اپنے علم و مطالعہ کی کمی کی وجہ سے حق و باطل میں امتیاز کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتے۔ مجھے افسوس ہے کہ آپ بھی اس طرح کے فتنہ پھیلانے والوں سے متاثر ہو کر حدیث کے خلاف بدگمانیوں میں مبتلا ہو گئے ہیں، ورنہ جن باتوں کا آپ نے حوالہ دیا ہے، اگر آپ خود ان پر غور کرتے تو بڑی آسانی سے ان کا صحیح پہلو معین کر لیتے۔ مجھے اندیشہ ہے کہ آپ جتنا شوق حدیث پر اعتراض کرنے کا رکھتے ہیں، اتنا ان کے سمجھنے کا نہیں رکھتے۔

آپ نے جن حدیثوں کو قرآن کے خلاف ہونے کے ثبوت میں پیش کیا ہے، وہ ہرگز قرآن کے خلاف نہیں ہیں۔ قرآن مجید میں کوئی ایسی آیت نہیں ہے جس سے یہ مفہوم نکلتا ہو کہ روزہ رکھ کر میاں بیوی ایک دوسرے کو چھو نہیں سکتے یا ایک بستر میں لیٹ نہیں سکتے یا ایک دوسرے کا بوسہ نہیں لے سکتے یا دونوں ہم آغوش نہیں ہو سکتے۔ ممانعت جس چیز کی ہے، وہ وطی کی ہے۔ باقی چیزیں شوہر کے لیے مباح ہیں، بشرطیکہ وہ اتنا کمزور آدمی نہ ہو کہ ذرا سی تحریک سے آپے سے باہر ہو جانے والا ہو اور اندیشہ ہو کہ اس کے قدم حرام کے حدود میں جا پڑیں۔ اگر کوئی شخص اپنے اندر یہ کمزوری محسوس کرتا ہے تو اس کے لیے بہتر یہی ہے کہ وہ روزے کی حالت میں بیوی سے دور ہی دور رہے، جیسا کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے ایک روایت میں اس کی تشریح فرما دی ہے۔ لیکن اگر ایک شخص اپنے نفس پر قابو رکھتا ہے تو اس بات میں کوئی حرج نہیں کہ وہ روزہ رکھ کر اپنی بیوی کو پیار کر لے۔ قرآن نے بیوی کو کہیں بھی نواقض روزہ میں سے شمار نہیں کیا ہے۔ مذکورہ حدیثوں میں ''مباشرت'' کا جو لفظ آیا ہے، اس سے آپ کو کوئی غلط فہمی نہیں ہونی چاہیے۔ اس سے مراد یہاں جماع نہیں ہے، بلکہ مجرد پاس سونا، بیٹھنا اور ظاہری افعال محبت ہیں۔

اسی طرح قرآن میں کہیں بھی یہ بات نہیں لکھی ہے کہ حیض کے ایام میں عورت کو اچھوت بنا کے رکھ دیا جائے کہ نہ میاں کو اس کو ہاتھ لگانے کی اجازت ہو اور نہ وہ میاں کو ہاتھ لگا سکے۔ یہودیوں کے ہاں، بلاشبہ ایام حیض میں میاں بیوی کے لیے اس طرح کی پابندیاں تھیں، لیکن یہ ان کے اصل مذہب سے زیادہ ان کے فقہ کی پیدا کردہ تھیں۔ اسلام نے جو ایک دین فطرت ہے، اس طرح کی تمام خلاف فطرت پابندیوں کو ختم کر دیا ہے۔ صرف اتنی پابندی رکھی ہے کہ مرد ایام حیض میں عورت کے ساتھ جماع نہیں کر سکتا۔ آپ نے حیض کے زمانہ میں عورت سے دور رہنے کی بابت جس آیت کا حوالہ دیا ہے، اس میں ''دور رہنے'' سے مراد مجامعت سے پرہیز کرنے کے ہیں۔ یہ معنی نہیں ہیں کہ اس زمانہ میں عورت نجاست کا ایک ڈھیر بن جاتی ہے، جس کو گھر سے نکال باہر پھینک دینا چاہیے۔ آپ حضرات پر یہ تعجب ہوتا ہے کہ انکار حدیث کے جوش میں آپ لوگوں کو اپنی اس روشن خیالی پر بھی رحم نہیں آتا جس کا اظہار آپ جیسے لوگ

عورت کے بارہ میں اکثر فرمایا کرتے ہیں۔ یا تو قرآن و حدیث سب کا انکار کر کے عورت کی وہ شان بڑھاتے ہیں کہ مرد بھی اس کے آگے گرد ہو کر رہ جاتا ہے یا پھر ایک حدیث کے انکار کے شوق میں اس کو اس درجہ گراتے ہیں کہ مرد اس کے پاس سے بھی گزر جائے تو آپ لوگوں کے نزدیک گندا اور نجس ہو جاتا ہے۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی جن روایتوں کو آپ نے تضاد کی مثال میں پیش کیا ہے، اس تضاد کو آپ بڑی آسانی کے ساتھ رفع کر سکتے تھے، بشرطیکہ آپ اس فن سے کچھ واقف ہوتے۔ ان دونوں روایتوں میں آپ ترجیح کا اصول استعمال کر کے ایک کو راجح اور دوسری کو مرجوح بھی قرار دے سکتے ہیں اور اگر ذرا تامل سے کام لیں تو بڑی آسانی سے ان میں جمع و تطبیق کا قاعدہ بھی چل سکتا ہے۔

ترجیح کا پہلو یہ ہے کہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زوجہ محترمہ ہیں اور وہ خود اپنا معاملہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ بیان کرتی ہیں اور محض ایک دو مرتبہ کا کوئی اتفاقی واقعہ پیش نہیں کرتی ہیں، بلکہ اپنا ایک ایسا تجربہ بیان کرتی ہیں جو ان کو بار بار پیش آیا ہے اور جس میں بظاہر کسی غلط فہمی کا امکان نہیں ہے۔ دوسری طرف حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت ہے جس میں متعدد پہلو اس امکان کے موجود ہیں کہ ان کو کوئی غلط فہمی ہو گئی ہو، اس وجہ سے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی روایت اس معاملہ میں ترجیح کے لائق ہے۔

دوسرا پہلو جمع و توفیق کا ہے۔ اس کی شکل یہ ہے کہ آپ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ والی روایت کو اس حالت کے ساتھ مخصوص کر دیں، جبکہ کوئی اجنبی غیر محرم عورت بے حجابانہ نمازی کے سامنے آ جائے۔ ایک اجنبی عورت کے بے حجابانہ سامنے آ جانے سے اس سکون طبیعت اور توجہ الی اللہ کے درہم برہم ہو جانے کا اندیشہ ہے جو نماز میں مطلوب ہے۔ اس حدیث کو اس حالت کے ساتھ مخصوص کر دینے کے بعد دونوں حدیثوں کے الگ الگ محل متعین ہو جاتے ہیں اور وہ تضاد رفع ہو جاتا ہے جس سے پریشان ہو کر آپ پورے ذخیرۂ حدیث کو دریا برد کر دینا چاہتے ہیں۔

جنت کے ماں کے پاؤں کے نیچے ہونے اور پھر دوزخ میں عورتوں کی کثرت سے متعلق آپ نے جو روایات نقل کی ہیں، ان میں تضاد کا پہلو میری سمجھ میں نہیں آیا۔ پہلی حدیث میں ماں کی خدمت اور اس کے ساتھ حسن سلوک کی تشویق و ترغیب ہے اور اس کا اجر جنت بیان کیا گیا ہے اور اس میں شک نہیں کہ ایک مسلم بیٹے کے لیے ماں کی خدمت کا یہی صلہ ہے، عام اس سے کہ ماں کافرہ ہو یا مومنہ۔ دوسری حدیث میں عورتوں کی بعض عام بیماریوں کی طرف توجہ دلائی گئی ہے جو مردوں کے بالمقابل عورتوں میں زیادہ پائی جاتی ہیں اور جن کے سبب سے دوزخ میں ان کی تعداد زیادہ ہو گی۔ ان دونوں حدیثوں میں دو بالکل الگ الگ حقیقتیں بیان ہوئی ہیں، ان میں تضاد کا کیا سوال

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

ہے؟ کہیں آپ نے جنت کو ماں کے پاؤں کے نیچے ہونے کا یہ مطلب تو نہیں سمجھا ہے کہ جنت عورت کی تحویل میں دے دی گئی ہے، وہ جس کو چاہے جنت میں داخل کرے اور جس کو چاہے جنت سے محروم کر دے۔ اور یہ مطلب لے کر آپ اس میں اور دوسری حدیث میں تضاد پیدا کر رہے ہوں؟ اگر یہ بات ہے تو اس میں حدیث کا کوئی قصور نہیں ہے، سارا قصور آپ کے فہم کا ہے۔

جن حدیثوں کو آپ نے خلاف عقل قرار دیا ہے، ان میں بھی کوئی بات خلاف عقل نہیں ہے، ہر بات بالکل عقل کے مطابق ہے، بشرطیکہ ایک شخص کے پاس خود اپنی گرہ کی عقل ہو اور وہ اس کو تعبیرات حقائق کے سمجھنے کے لیے استعمال کرنے کا ذوق اور سلیقہ رکھتا ہو۔ میں پورا اطمینان رکھتا ہوں کہ اگر کوئی عقل مند یورپین ان حدیثوں کو پڑھے گا تو ان کا کوئی نہ کوئی صحیح محل وہ ضرور نکال لے گا۔ البتہ ہمارے اندر کے جو یورپ زدہ ہیں، وہ بے سمجھے بوجھے اس طرح کی باتوں پر اعتراض کرتے ہیں۔

میں بعینہٖ ان حدیثوں پر بحث کرنے کے بجائے یہ مناسب خیال کرتا ہوں کہ آپ کے سامنے چند اصولی باتیں رکھوں جن سے آپ اگر چاہیں گے تو اس طرح کی حدیثوں کو سمجھنے میں مدد لے سکتے ہیں۔

پہلی بات یہ ہے کہ ان میں بعض اہم حقائق کی تعبیر کی گئی ہے، اس وجہ سے ان کو ظاہر پر محمول کرنا صحیح نہیں ہے۔

دوسری یہ کہ جس طرح قرآن میں بعض باتیں ازقبیل متشابہات ہیں، اسی طرح حدیث میں بھی بعض باتیں ازقبیل متشابہات ہیں، اور ان کی حقیقت معلوم کرنے کے درپے ہونا فتنہ سے خالی نہیں۔ اگر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف ان کی نسبت پر اطمینان ہے تو محض اس وجہ سے ان کا انکار کرنا صحیح نہیں ہے کہ وہ آپ کے علم وادراک سے مافوق ہیں۔

تیسری یہ کہ ہمارا علم محدود ہے، اس وجہ سے ایک شے کے ایک پہلو کو دیکھ کر ہم یہ سمجھ لیتے ہیں کہ بس اس کا یہی ایک پہلو ہے، حالاں کہ اس کے بے شمار پہلو ہو سکتے ہیں جن سے ہم بے خبر ہو سکتے ہیں اور تنہا وہی ان کا احاطہ کر سکتا ہے جس کا علم ہر چیز کو محیط ہے۔

ان باتوں کو سامنے رکھتے ہوئے اب حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ والی حدیث پر غور فرمایئے کہ اس میں کون سی بات ہے جس کا انکار کیا جا سکتا ہے؟ کیا اس حقیقت سے انکار کیا جا سکتا ہے کہ غروب کے بعد سورج خدا کے تخت جلال کے آگے سجدہ میں گر جاتا ہے؟ کیا قرآن میں یہ حقیقت بیان نہیں ہوئی ہے کہ کائنات کی ہر چیز خدا کے آگے سجدہ کرتی ہے اور یہ کہ رات میں ہر چیز کا سایہ خدا کے آگے سربسجود رہتا ہے اور آفتاب کے طلوع کے ساتھ ہی اٹھنا شروع ہوتا ہے اور پھر اس کے رکوع وسجود کے ساتھ ہر چیز رکوع وسجود کی حالت میں ہو جاتی ہے؟ کیا آپ اس حقیقت سے انکار کر

سکتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ جب چاہے گا سورج کو مشرق سے طلوع ہونے کی اجازت دینے سے انکار کر دے گا اور سورج کو اس حکم کی تعمیل کرنی پڑے گی؟ آخر آپ کو ان حقائق سے کن وجوہ کی بنا پر انکار ہے؟ کیا محض اس بنا پر کہ آپ ظاہر میں ایسا نہیں دیکھ رہے ہیں؟ اگر یہ بات ہے تو یہ محض ایک منفی پہلو ہے، اثباتی طور پر آپ نے اس سلسلہ میں کیا تحقیقات فرمائی ہیں؟

حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کی جس روایت کا آپ نے حوالہ دیا ہے، اس میں کچھ اضطراب ہے، اور اس کو ماہرین فن نے خود محسوس کیا ہے، لیکن یہ اضطراب پورے ذخیرۂ حدیث کی بے اعتباری کا ثبوت نہیں ہے، بلکہ اس بات کا ثبوت ہے کہ احادیث کو نقد و نظر کے ساتھ قبول کرنا چاہیے۔

احادیث کے نقد و نظر میں اہل فن نے صرف سند ہی کو معیار نہیں قرار دیا ہے، بلکہ متعدد چیزوں کو بھی قرار دیا ہے۔ لیکن میں ان چیزوں کا بیان کرنا یہاں غیر ضروری سمجھتا ہوں، اس لیے کہ ان چیزوں کا علم ان لوگوں کے لیے مفید ہے جو باقاعدہ فن حدیث سے واقف ہوں۔ جن لوگوں کا حال یہ ہے کہ فن حدیث تو درکنار سرے سے عربی زبان ہی سے ناواقف ہیں، محض سنی سنائی باتوں کی بنا پر حدیث پر تنقید کرنے بیٹھ گئے ہیں، ان کو تنقید حدیث کے معیارات معلوم ہونے سے پہلے عربی زبان، قرآن مجید اور حدیث کی واقفیت ضروری ہے اور میں آپ کو یہ مشورہ دوں گا کہ آپ پہلے یہ واقفیت بہم پہنچائیں۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

مولانا الطاف حسین حالی

برکت اتفاق

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

کہہ رہا تھا یہ اک آزاد کہ ہے جن میں ملاپ
دولت و بخت ہے ہر حال میں ان کے ہمراہ
نہ انھیں حاجت اعوان[1] نہ تلاش انصار
نہ انھیں خوف بداندیش نہ بیم بدخواہ!
پر نہیں رابطہ جس قوم میں اور ایک جہتی
اس کی دنیا سے یہ سمجھو کہ گئی عزت و جاہ
نہ ملا ذان[2] کے لیے قلعہ نہ خندق نہ فصیل
نہ مفید ان کے لیے فوج نہ لشکر نہ سپاہ
ایک ملا نے سنا جب یہ سخن فرمایا
تکیہ اور اس قدر اسباب پہ کرنا ہے گناہ
اتفاق اور نفاق اصل میں کچھ چیز نہیں
دست قدرت کے ہے سب ہاتھ سفید اور سیاہ
واں نہ ملت کی ضرورت ہے نہ کچھ پھوٹ کا ڈر
پڑ گئی فضل کی مولا کے جدھر ایک نگاہ
کہا آزاد نے سچ ہے کہ وہ دے ساتھ اگر
کر دیں افراد پراگندہ[3] جماعت کو تباہ
پر مجھے خوب ہے اللہ کی عادت معلوم
اس کو جب[4] دیکھا ہے دیکھا ہے جتھوں کے ہمراہ

---

[1] دوست، مددگار۔

[2] جاے پناہ۔

[3] بکھرے ہوئے۔

[4] 'ید اللّٰہ فوق جماعۃ' کی طرف اشارہ ہے۔